مجلس ادارت

سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

فروری سنہ ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دارالمصنفین کے اہتمام میں جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں اسی عنوان پر دارالمصنفین نے ایک اہم اور نیا سلسلۂ تالیفات شروع کیا ہے، جس کی اب تک پانچ جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔

جلد۱ اس میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے قلم سے اس سمینار کی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد قلم بند ہوئی ہے۔ قیمت ۲۰ روپے۔

جلد۲ اس میں وہ تمام مقالات جمع کر دیے گئے ہیں جو اس سمینار میں پڑھے گئے تھے اور جو معارف سنہ ۸۲ء سے لے کر سنہ ۸۳ء تک سلسلہ وار شایع بھی ہو چکے ہیں۔ قیمت ۳۴ روپے

جلد۳ اس میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سمینار کے علاوہ جو مقالات لکھے گئے ہیں، اور معارف میں شایع بھی ہو چکے ہیں، جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپے۔

جلد۴ تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپے۔

جلد۵ اسلامی علوم و فنون سے متعلق مستشرقین کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے بعد ان کے اسلام اور تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندوی کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۲۰ روپے۔

"منیجر"

جلد ۱۴۴	ماہ جمادی الاولی سنہ ۱۴۱۰ھ مطابق ماہ دسمبر سنہ ۱۹۸۹ء	عدد ۶

مضامین

ضروری اطلاع

کاغذ، کتابت وطباعت کی گرانی کی وجہ سے جنوری سنہ ۹۰ء سے معارف کا سالانہ چندہ چالیس روپیے کر دیا گیا ہے، لیکن جن خریداروں کا چندہ آچکا ہے، یا جو نئے خریدار دسمبر تک بنا چندہ بھیج دیں گے ان سے پرانا چندہ ہی لیا جائے گا۔

بیرونی ممالک کے لیے سالانہ چندہ (ہوائی ڈاک سے) دس پونڈ یا بارہ ڈالر اور (معمولی ڈاک سے) تین پونڈ یا پانچ ڈالر ہوگا۔

"منیجر"

شذرات

نومبر میں ہونے والے عام انتخاب کے بارے میں جس تشدد اور بدعنوانی کا اندیشہ ظاہر کیا جارہا تھا وہ درست نکلا، جگہ جگہ سے خوں ریزی اور بوتھوں پر قبضہ کرنے کی اطلاعات موصول ہوئیں، علاوہ ازیں اس انتخاب میں غیر متوقع طور پر بعض ایسی جماعتوں کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی جن کا سیکولر کردار عام طور سے مشتبہ سمجھا جاتا رہا ہے، سب سے زیادہ حیرت اور افسوس کی بات یہ ہوئی کہ مرکز میں کسی سیاسی جماعت کو قطعی اکثریت نہ ملنے کی وجہ سے انتخابات کے بعد بھی ملک کو مستحکم اور مضبوط حکومت نصیب نہیں ہوسکی، پارلیمنٹ کے ساتھ جن ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے ان میں عموماً حکمراں جماعتوں کو شدید ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، اس کی وجہ سے اترپردیش جیسے بڑے صوبہ سے کانگریس کی حکومت ختم ہوگئی، مگر جنوبی ہند کی بعض ریاستوں میں جہاں وہ برسراقتدار نہیں تھی، اب اقتدار میں آگئی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ برسراقتدار جماعتوں سے لوگوں میں عام نفرت و بیزاری پائی جاتی تھی، اس کی وجہ ظاہر ہے، کیا مرکز اور صوبوں میں نئی حکومتیں اس سے سبق لے کر آیندہ عوام کی امنگوں اور خواہشوں کو پورا کریں گی؟

موجودہ شکست وریخت کے بعد بھی دوسروں کے مقابلہ میں کانگریس ہی کو پارلیمنٹ کی زیادہ سیٹیں ملی ہیں، مگر وہ حکومت بنانے کے اپنے حق سے دستبردار ہوگئی اس لیے راشٹریہ مورچہ کے لیے حکومت بنانا سہل ہوگیا، اس کی حکومت میں مورچہ کی پانچ جماعتیں شامل ہیں، بھارتیہ جنتا پارٹی اور کمیونسٹ پارٹیوں نے براہ راست حکومت میں شریک ہونے سے انکار کردیا اور باہر رہ کر حکومت کی تائید کرنے کا فیصلہ کیا ہے، ان میں باہم جو بنیادی اور اصولی اختلاف ہے اس کی وجہ سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس طرح اور کب تک اپنے کو ہم آہنگ رکھیں گی، اس کے علاوہ حکومت میں شریک جماعتوں کے افراد کا رویہ بھی اس کے لیے مشکلات اور خطرے پیدا کرسکتا ہے، ایسے نازک اور پیچیدہ حالات میں وزیر اعظم مسٹر وی۔ پی سنگھ کا ملک کی قیادت کی ذمہ داری سنبھالنا بڑی حوصلہ مندی کی بات ہے، وہ ایک سلجھے ہوئے آدمی ہیں، ان کی اعتدال پسندی، سوجھ بوجھ اور دانشمندانہ قیادت سے توقع ہے کہ وہ ملک کو صاف ستھری اور بہتر حکومت دینے میں

کامیاب ہوں گے، اور قوم کو مایوس نہیں کریں گے، انھیں ملک کی لسانی و مذہبی اقلیتوں اور کمزور اور پسماندہ طبقوں کو بھی اعتماد میں لینا ہوگا۔

دورِ جدید کے اہم علمی و دینی مسائل پر شریعت اسلامی کی روشنی میں غور و فکر کے لیے مجمع الفقہ الاسلامی ہند کا قیام عمل میں آیا ہے، اس کا پہلا سمینار اپریل ۸۹ء میں ہمدرد کنونشن سنٹر ہمدرد نگر نئی دہلی انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی کے اشتراک تعاون سے ہوا تھا اور اب دوسرا فقہی سمینار بھی وہیں انسٹی ٹیوٹ کے تعاون سے ۸ تا ۱۱ دسمبر کو بڑے اہتمام سے ہوا، اس کا افتتاح مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی (پاکستان) نے کیا اور صدارت ڈاکٹر جمال الدین عطیہ قاہرہ نے کی، اور مسلمانوں کو درپیش موجودہ مسائل کے حل کے لیے اجتماعی اجتہاد کی ضرورت و اہمیت بتائی، انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر منظور عالم نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے علمار کو جدید مسائل میں رہبری کرنے کی دعوت دی اور سمینار کے داعی مولانا مجاہد الاسلام قاسمی نے سمینار کی غرض و غایت اور اس کے موضوع کی وضاحت بڑے موثر اور دلنشین انداز میں کی۔

سمینار میں دو۲ مسائل زیر بحث آئے (۱) نوٹ کی شرعی حیثیت اور افراطِ زر کے سبب کرنسی کی قوتِ خرید کا کم یا زیادہ ہونا اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے شرعی احکام (۲) سودی کاروبار کا عموم، ہندوستان جیسے اسلامی ملکوں میں اس کی نوعیت اور شرعی حکم، صنعت و حرفت، زراعت و تجارت کی ترقی کے لیے سرکاری بینکوں سے ملنے والے سودی قرضے اور پرائیویٹ کمپنیوں اور سرمایہ کاروں کی طرف سے سود کی شرط پر تجارت وصنعت کے لیے سرمایہ کاری وغیرہ پر ملک کے اکثر مکاتب فکر کے علما اور دینی مدارس کے مفتیان کرام نے اپنے مقالے پیش کیے، ان کے علاوہ معاشیات و اقتصادیات کے جدید ماہرین نے بھی بحث و مباحثہ میں پوری دلچسپی لی، دارالمصنفین سے راقم اور مولوی عبید اللہ کوٹی ندوی نے سمینار میں شرکت کی تھی، اس بحث و تمحیص سے دونوں مسئلوں کے مختلف پہلو سامنے آئے جن پر مزید غور و فکر کے لیے تین ذیلی کمیٹیوں کی تشکیل کی گئی، جن کی رپورٹ کی روشنی میں آیندہ کوئی متفقہ فیصلہ کیا جائے گا۔

سمینار کے ایک جلسہ میں فسادات میں مسلمانوں کی جان و مال کو پہونچنے والے بھاری نقصان کے پیش نظر

بیمہ کے مسئلے پر بھی غور ہوا، اکثر لوگوں کی رائے یہ تھی کہ مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ کے فیصلہ کی توثیق کی جانی چاہیے، ایک جلسہ میں اعضاء کی پیوندکاری سے متعلق پہلے فقہی سمینار کی تجویزوں کی توثیق کی گئی، مولانا مجاہدالاسلام قاسمی نے اجلاس کی کارروائی نہایت خوش اسلوبی سے چلاکر اپنی علمی وعملی قوت، فقہی ودینی بصیرت اور تنظیمی صلاحیت کا نقش دلوں پر بیٹھایا اور ڈاکٹر منظور عالم اور ان کے رفقائے کار نے بڑے حوصلے سے مہمانوں کو راحت وسہولت بہم پہونچائی، اللہ تعالیٰ ان کے دینی عزائم کو کامیاب کرے اور جزائے خیر دے۔

۲ر دسمبر کو غالب اکیڈمی نئی دہلی میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم سابق ناظم دارالمصنفین پر ایک باوقار سمینار ہوا جس میں دہلی کے منتخب اصحاب کمال شریک تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی معذوری کی وجہ سے اس کا افتتاح نہیں فرماسکے، ان کا پرمغز افتتاحی خطبہ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی نے پڑھا، پروفیسر مشیرالحق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی نے اپنی صدارتی تقریر میں دارالمصنفین اور سید صباح الدین مرحوم کی اہم خصوصیات بیان کرتے ہوئے ان کے اس خاص امتیاز کا تذکرہ کیا کہ وہ علمی وعملی دونوں خوبیوں کے جامع تھے، سمینار کے پہلے جلسہ کا آغاز مولانا عبیداللہ عباس ندوی کے پرحاصل مقالہ سے ہوا، مولوی عمیرالصدیق رفیق دارالمصنفین نے مرحوم کے متعلق اپنے احساسات و تاثرات بیان کرکے خود کو اور دوسروں کو بھی تڑپادیا، پروفیسر آفاق صدیقی نے ان کے حسن سلوک کا ذکر کرکے سب کو متحیر اور نمناک کردیا، مولوی عبیداللہ کوٹی رفیق دارالمصنفین کے مقالہ میں ناظم دارالمصنفین کی حیثیت سے مرحوم کے علمی انتظامی کمالات کا مرقع پیش کیا گیا تھا، جلسہ میں خواجہ حسن ثانی نظامی، پروفیسر نثار احمد فاروقی اور سابق مرکزی وزیر جناب یونس سلیم کے تاثرات بھی دلچسپی سے سنے گئے۔

دوسرے جلسہ میں حکیم عبدالقوی مدیر صدق جدید لکھنؤ، ڈاکٹر جمال الدین اور راقم نے مقالے پڑھے، حکیم صاحب نے معارف کے مدیر کی حیثیت سے موصوف کے کمالات دکھائے، آخری دونوں مقالوں میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ کی تدوین میں ان کے کارنامے زیربحث آئے، جناب سید شہاب الدین دسنوی نے مرحوم کا سوانحی خاکہ پیش کیا، شریف الحسن نقوی اور ڈاکٹر قمر رئیس صدر جلسہ کی تقریریں بھی ہوئیں اور جناب خلیق انجم کی خوش نوائی ہر جلسہ میں حاضرین کو محظوظ کرتی رہی، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے سلیقہ مندی سے نظامت کی، ان کی اور سید صباح الدین مرحوم کے صاحبزادے ڈاکٹر احتشام الرحمن کی تگ ودو سے یہ سمینار بہت کامیاب رہا، مرحوم کی کتابوں، مسودوں اور تصویروں کی اچھی نمائش بھی کی گئی تھی جس کا اہتمام

مقالات

تحریک آزادی میں بنگال کے مسلمانوں کا حصہ

از

پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڈھ

(پہلا مولانا محمد علی میموریل لیکچر جو ۱۹ر فروری ۱۹۸۹ء کو کلکتہ میں دیا گیا)

ہندوستان کے جن علاقوں میں سیاست ارضی (GEOPOLITICS) کی سب سے زیادہ کارفرمائی نظر آتی ہے، اور جہاں تاریخی عوامل کا انداز، سیاست کا رخ، معاشی زندگی کے طور طریقے سب پر ارضی سیاست کا گہرا نقش محسوس ہوتا ہے، ان میں بنگال کو ایک خاص اہمیت اور انفرادیت حاصل ہے۔ یہاں سامراجی طاقتوں کا تسلط، پھر ان کے خلاف تحریک آزادی کا نشوونما ارضی سیاست کے ان عناصر کا رہین منت رہا ہے۔ بنگال میں تحریک آزادی کا جائزہ لینے اور اس کے اثرات وتعینات کو سمجھنے کے لئے بعض حقائق پر نظر ہونی ضروری ہے۔

(۱) اٹھارویں صدی میں سلطنت مغلیہ کی اقتصادی زندگی کا انحصار بنگال پر تھا، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"در عہد محمد شاہ ہر سال از بنگالہ یک کرور مقرر بود، وہمیشہ صوبہ دار آنجا بلا توقف می فرستاد، باوصف ادائے ایں مبلغ مالدار ترین امرائے ہندوستان صوبہ دار بنگالہ بود" (شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات پہلا ایڈیشن ص ۵۰)

عہد محمد شاہ میں بنگال سے ہر سال ایک کرور کی آمدنی تھی اور وہاں کا صوبہ دار ہمیشہ بلا توقف بھیجتا رہتا تھا۔ اس رقم کی ادائیگی کے باوجود صوبہ دار بنگالہ ہندوستان کے امراء میں انتہائی مالدار آدمی تھا۔

اس طرح اقتصادی حیثیت سے سلطنت مغلیہ کی شہ رگ بنگال میں تھی۔ دہلی کا حال تو یہ ہو چکا تھا کہ دکن سے جو طوفان اٹھتا تھا، وہ لال قلعہ سے آکر ٹکراتا تھا، پنجاب سے جو آندھی اٹھتی تھی اس کے زلزلے دہلی میں محسوس ہوتے تھے، نادر شاہ سے جن حملوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا وہ کسی طرح ٹوٹنے میں نہ آتا تھا۔ دہلی کی معاشی اور اقتصادی زندگی پریشاں ہو کر رہ گئی تھی۔ اور گو لال قلعہ اسی جگہ تھا، اور دربار معلیٰ اب بھی منعقد ہوتا تھا، لیکن حقیقت میں نگاہیں آنے والے انقلاب کے آثار دیکھ رہی تھیں۔ اور بقول میرؔ ؎

بھری بہار میں رویا کئے بہار کو ہم   قبائے لالہ و گل میں جھلک رہی تھی خزاں

سلطنت مغلیہ کا ایک حصہ ہونے کے باعث بنگال ان اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ مغل بادشاہوں کی کم ہمتی اور امرار کی سیاسی بازی گری کے اثرات یہاں تک پہونچے تھے۔

(۲) ہندوستان میں اب تک جو بیرونی طاقتیں داخل ہوئی تھیں، وہ شمالی مغربی علاقوں سے خشکی کے راستے آئی تھیں۔ سلطنت مغلیہ کی ساری مدافعانہ پالیسی ان ہی علاقوں سے متعلق تھی، ان کی نظر بلخ و بدخشاں میں سیاست کے اتار چڑھاؤ پر رہتی تھی، لیکن سمندر کی جانب سے پیدا ہونے والے خطرات کا احساس ان کو نہ تھا۔ اکبر کے زمانہ میں پرتگالی سمندر پر جس طرح قابض ہو گئے تھے اور حج تک کے لئے جانا دشوار ہو گیا تھا، اس کا علم مغل بادشاہوں کو تھا، لیکن وہ کوئی واضح بحری پالیسی اختیار کرنے سے قاصر رہے تھے۔ خلفاء آل عثمان نے اس خطرہ کی طرف آگاہ کرنا چاہا بھی، لیکن مغلوں کی بین الاقوامی سیاست نے (اگر وہ کچھ تھی) اس کی اہمیت کا احساس نہ ہونے دیا۔ ملک الشعراء فیضیؔ یہ بلند بانگ اعلان کرتا رہا ؎

برم از دل اہل اسلام زنگ   بدریا کنم غرق اہل فرنگ

لیکن مغلوں کو بالکل احساس نہ تھا کہ خطرے کے بادل کہاں جمع ہو رہے ہیں۔ مریم زمانی

کے ایک جہاز کا جو حال ہوا تھا اس کی تفصیلی داستان "JOURNAL OF THE AMERICAN ORIENTAL SOCIETY کے ایک حالیہ تحقیقی مضمون

"THE CAPTURE OF MARYAM-UZ-ZAMANI'S SHIP: MOGHUL WOMEN AND EUROPEAN TRADERS"

(VOL: 108/NURBER 2/APRIL 1988, PP 227, 238)

میں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ان حالات کا تقاضا تھا کہ مغل بادشاہ سمندروں سے متعلق مضبوط حکمت عملی پر عامل ہوں، لیکن ان کی سیاسی بصیرت اس طرف ان کی رہنمائی نہ کر سکی۔

(۳) یورپ میں صنعتی انقلاب کے ساتھ سامراجی عزائم بھی بیدار ہو گئے تھے۔ تجارتی کمپنیاں سب سے پہلے مشرق کی طرف متوجہ ہوئیں اور مغل بادشاہوں سے مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ اکبر کے زمانہ سے مراعات کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ آخری مغل بادشاہ تک کسی نہ کسی صورت میں چلتا رہا۔ تا آنکہ اقتدار اعلیٰ کلی طور پر غیر ملکی کمپنیوں کے ہاتھوں میں پہونچ گیا۔

ان تجارتی کمپنیوں کو اس حقیقت کا احساس تھا کہ معاشی زندگی پر قابو، سیاسی تسلط کی راہیں ہموار کر دے گا۔ یہ بیرونی ممالک اپنے کارخانوں کی تیار کی ہوئی اشیاء کے لئے نئی منڈیوں کی تلاش میں ضرور تھے، لیکن وہ تاجر کے چولے میں فتوحات اور حکمرانی کے خواب دیکھ رہے تھے، انگریز ہوں یا فرنچ، پرتگالی ہوں یا ڈچ، سب یکساں سامراجی مزاج رکھتے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے حالات کا جائزہ لیا، ہندوستانیوں کے مزاج کو سمجھا، ان کی ایک ایک مضبوطی اور کمزوری کو پرکھا، اور جن شاطرانہ چالوں کا جال دربار کے چاروں طرف بچھا ہوا تھا، ان میں اپنی مطلب براری کی راہیں تلاش کر لیں۔ جب یہ سب کچھ سمجھ لیا تو

پرانے نظام کو مسمار کرنے کے لیے مستعد ہو گئے۔ اور انتظار کرنے لگے کہ وقت کب ان کے حق میں کروٹ لیتا ہے! شاید ہی اتنی تھوڑی فوج نے جتنی پلاسی کے میدان میں انگریزوں کی تھی، اتنے بڑے ملک پر اس طرح قابو پایا ہو۔ یہ سیاسی بازی گری تھی جس نے ان کی کامیابی کی راہیں ہموار کر دیں۔

(۴) سائنس کی تحقیقات اور بین الاقوامی سیاست کی شاطرانہ چالوں نے جنگوں کے نقشے بدل دئے تھے اور جدوجہد کے میدان بھی اب وہ نہ رہے تھے جو پہلے کبھی تھے۔ جنگ اب میدانِ کارزار میں شجاعت و تہور کا نام نہ تھا بلکہ ایک اہم حصہ جاسوسوں، مخبروں، اور دلالوں کی شکل میں سرگرم رہتا تھا ہندوستان کے سیاسی اور معاشی حالات انتہائی حسرت ناک حد تک ابتر ہو چکے تھے مسلمانوں کے بیشتر گروہوں نے اپنی گردنوں کو عظمتِ گزشتہ کے ریگ زار میں چھپا لیا تھا، اور یہ سمجھتے تھے کہ وقت کا جابر ہاتھ ان کے روز و شب پر کبھی اثر انداز نہ ہو سکے گا جہاں جذبہ تھا وہاں وسائل نہ تھے جہاں وسائل تھے وہاں جاں نثار نظر نہ آتے تھے۔ ان حالات میں جنگوں کے نتائج واضح تھے۔

(۵) اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں مغلیہ اقتدار کو دو بڑی جنگیں لڑنی پڑیں۔ ایک جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) دوسری جنگ پانی پت (۱۷۶۱ء) موخر الذکر میں ان کو فتح ہوئی پہلی میں ان کو شکست۔ لیکن نتیجہ دونوں کا ایک ہی رہا۔ زوال کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ جنگ پانی پت نے مرہٹوں کا بڑھتا ہوا طوفان روک دیا، لیکن مغلیہ سلطنت میں اتنا دم ہی نہ تھا کہ وہ اپنی فتح کے ثمرات کو جمع کر کے ان سے کوئی فائدہ اٹھا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ پانی پت کا اصل فائدہ فاتحین جنگ پلاسی نے اٹھا لیا۔ بنگال پر مرہٹوں کے حملوں کا سلسلہ ٹوٹا تو انگریزوں کو اپنے اقتدار کے پھیلانے میں مدد مل گئی۔ راہ کی دشواریاں دور ہو گئیں اور صرف مقامی حالات سے نبرد آزمائی ہی حصولِ مقصد کے لئے کافی نظر آنے لگی۔

(۶) بنگال کے جغرافیائی حالات سے انگریزوں کو اپنی طاقت کے استحکام میں بڑی مدد ملی۔ انہوں نے جگہ جگہ قلعے اور احاطے تعمیر کئے اور اپنی طاقت کو نہایت موثر انداز میں مختلف جگہوں پر منظم کر لیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان قلعوں کی حیثیت اتنی مضبوط ہو گئی کہ کوئی ایسی سیاسی طاقت نہ رہی جو ان کا استیصال کر سکے۔

(۷) غیر ملکی تسلط جب ایک بار قائم ہو گیا تو اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے بعض تدابیر نہ صرف ضروری ہو گئیں بلکہ ناگزیر۔ ان میں سب سے زیادہ اہم ایک ایسے طبقے کا وجود میں آنا تھا جو اپنی ذہنی اور عملی صلاحیتوں میں ان تمام لازمی خصوصیات کا حامل ہو جو تحریکِ آزادی کو عزم و استقلال کے ساتھ جاری رکھنے کے لئے ضروری تھیں۔ بالفاظ دیگر ایک BOURGEOISIE کا ہونا ازبس ضروری تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے سرسید کی سیاست سے علیحدگی کے فیصلہ کو سراہتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمانوں میں چونکہ اس وقت BOURGEOISIE وجود میں نہیں آئی تھی، اس لئے اگر بغیر تعلیم حاصل کئے وہ میدانِ سیاست میں داخل ہو جاتے تو اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ شمالی ہندوستان میں اس حقیقت کو سرسید نے اور بنگال میں نواب عبد اللطیف اور سید امیر علی نے سمجھا، اور ایک ایسا طبقہ تیار کر دیا جو اپنی ذہنی اور عملی صلاحیتوں میں ابنائے وطن کے دوش بدوش کھڑا ہو کر جدوجہد آزادی میں حصہ لے سکا۔ مسلمانوں میں یہ طبقہ کچھ دیر میں وجود میں آیا۔ ہندوؤں میں یہ طبقہ بہت پہلے پیدا ہو چکا تھا اور اس کے اقتصادی فوائد بھی ان کو حاصل ہو گئے تھے۔ چنانچہ صورتِ حال کے اس فرق نے مسلمانوں کی تحریکِ آزادی میں شمولیت کی نوعیت کو متاثر کیا۔

(۸) ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کا یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ جب بھی یہاں حالات نامساعد ہوئے اور فکری اضمحلال، ملی طاقت کو مفلوج کرنے لگا، مسلمانوں کی ملی اور فکری

زندگی نے حجاز مقدس سے توانائی حاصل کی۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ، سید احمد شہیدؒ، شریعت اللہؒ
تیتو میرؒ وغیرہ کی زندگیوں میں مقصدیت کا شعلہ اسی وقت بھڑکا جب حجاز مقدس میں ان کو
اپنی صلاحیتوں پر صیقل کرنے کا موقع ملا۔

(۹) مولانا آزاد نے سنہ ۱۹۲۳ء میں لکھا تھا:

"ہندوؤں میں آج مہاتما گاندھی مذہبی زندگی کی جو روح پیدا کر رہے ہیں، الہلال
اس کام سے سنہ ۱۹۱۴ء میں فارغ ہو چکا تھا، یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ مسلمانوں اور
ہندوؤں دونوں کی نئی طاقت اور سرگرمی اسی وقت شروع ہوئی جب دونوں میں
مغربی تہذیب کی جگہ مذہبی تعلیم کی تحریکوں نے پوری طرح فروغ پایا۔"

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں سیاسی تحریکیں مذہبی رنگ میں نمودار ہوئیں، اور سب
سے اہم کام جو انہوں نے انجام دیا وہ احساس و شعور کی بیداری تھی۔ صور کسی قسم کا ہو، کسی
رخ سے پھونکا جائے لیکن جب وہ غفلت و جمود سے بیدار کرنے کا کام انجام دینے لگے، تو
وہ بیداری زندگی کے ہر شعبہ میں کام کر سکتی ہے۔

فرائض کی بجا آوری پر تنبیہ ہو یا خلافت کی بقا کے لئے جد و جہد۔ فلسفہ عمرانیات کی
روشنی میں دیکھا جائے تو دونوں کا اثر ایک ہی مرتب ہوتا ہے اور وہ ہے "بیداری"۔ بنگال
کی جد و جہد آزادی میں مذہب کی راہ سے آنے والی ان تحریکوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں
وہ اب تک محتاج تفسیر و تعبیر ہیں۔ ان تحریکوں نے انگریز کے خلاف جذبات میں آگ لگائی،
سرفروشی کے جذبات بیدار کئے اور عزم و ہمت کی ایک روح پھونک دی۔ ہندوستان کی تحریک
آزادی میں سے ان اثرات کو نکال دیجئے تو ایک وسیع خلا نظر آئے گا۔ اور جذبات حریت کے
منبع و مخرج کا پتہ لگانا مشکل ہو جائے گا۔

بنگال میں مسلمانوں کی تحریک آزادی نے تین مختلف راہیں اختیار کیں۔ مذہبی، سیاسی اور اقتصادی۔ سب کا
مقصد ایک تھا، منزل بھی ایک تھی، لیکن راہیں مختلف تھیں۔ اور یہ صورت مقامی حالات میں ناگزیر تھی۔ بعض
مصنفین نے فرائضی اور دیگر مسلمان تحریکوں میں فرقہ واریت کے عناصر تلاش کئے ہیں، اور اس تاثر میں
انگریز مصنفین کے ہم نوا ہو گئے ہیں، لیکن صلاح الدین احمد (SOCIAL IDEAS AND
SOCIAL HANGE IN BENGAL 1818-1835, LEIDEN-1965) امیلندو دے
(AMALENDU DE) (ROOTS OF SEPARATISM IN NINETEENTH
CENTURY BENGAL, CALCUTTA-1974) اور رفیع الدین احمد (THE BENGAL
MUSLIMS 1871-1906 A QUEST FOR IDENTITY, DELHI-1981) کی تحقیقات
نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ان تحریکوں کی جد و جہد غیر فرقہ وارانہ رنگ میں تھی۔ اور ان پر فرقہ
وارانہ جذبات برانگیختہ کرنے کا الزام حق و دیانت کے خلاف ہے۔ جس طرح مجاہدین کی تحریک
کو سکھوں کے خلاف تحریک کا رنگ دیدیا گیا تھا، اسی طرح فرائضی تحریک کے حقیقی خد و خال کو
مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ ان سب غلط فہمیوں کے پردے چاک کئے
جائیں تاکہ حقیقت بے نقاب ہو اور یہ اندازہ کیا جا سکے کہ غلامی کی شب کو سحر کرنے میں مسلمانوں
کا کیا حصہ تھا۔

سیاسی جد و جہد | بنگال پر انگریزوں کا تسلط تاریخ کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ تاجروں
کے ایک ایسے گروہ نے جو وہاں کے کلیسائی نظام سے وابستہ تھا، اور جس کو لڑائی کا
مطلق کوئی تجربہ نہ تھا، ایک قدیم تہذیب اور ایک قدیم سیاسی نظام کو منہدم کرنے میں
کامیابی حاصل کر لی۔ اس سلسلہ میں یہ حقیقت فراموش نہیں کی جا سکتی کہ انگریزوں کو اپنے
مقصد کے حصول میں خود ہندوستانی باشندوں اور ہندوستانی وسائل سے مدد ملی تھی،

کمپنی کے صدر دفتر نے اس سلسلہ میں ان کی کوئی مدد نہیں کی۔ اور اپنا ایک پیسہ بھی ان جنگی اخراجات پر صرف نہیں کیا۔ جن کے باعث تاج برطانیہ میں کوہ نور کا اضافہ ہوا۔ یہ سب کچھ ہندوستانی وسائل ہی کے ذریعہ حاصل کیا گیا۔ ملک گیری اور تسخیر مملکت کی ایسی مثال مشکل سے ملے گی کہ مفتوح ہی کے پیسہ سے اور ان ہی کے ہاتھوں سے طوق وسلاسل بنوائے گئے ہوں۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد بنگال کی سیاسی زندگی میں دو شخصیتیں خاص طور پر نمایاں ہوئیں۔ مرشد قلی خاں اور علی وردی خاں، مرشد قلی خاں کی انتظامی صلاحیتوں کی تعریف اورنگ زیب نے اپنے رقعات میں کی ہے۔ سر جدوناتھ سرکار کا خیال ہے کہ اس نے بنگال میں جو نیا زمیندار طبقہ LANDED ARISTOCRACY پیدا کیا تھا، اس میں ہندوؤں کو خاص طور پر ترجیح دی تھی۔

MYMEN SINGH DIGHAPATIEA, NATORE

کے راج اسی کے زمانہ میں طاقت ہوئے۔ (HISTORY OF BENGAL II, P.P. 409-411)

مرشد قلی خاں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو جو مراعات دی گئی تھیں ان میں کمی کرنے کی مختلف تدابیر سوچیں۔ یہ مراعات شاہزادہ شجاع سے، جو اورنگ زیب کے آخری دنوں میں بنگال کا وائسرائے تھا، کمپنی نے حاصل کی تھیں۔ اور کلکتہ کے گرد ایک حصار بنالیا تھا۔ مرشد قلی خاں نے ان مراعات کو جاری رکھنے سے انکار کیا تو کمپنی نے دہلی، فرخ سیر کے پاس اپنا ایک وفد بھیجا۔ یہ وفد دو سال تک دہلی میں مقیم رہا اور رشوتوں کے زور پر اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ فرمان شاہی جاری ہوا کہ PRESIDENT OF CALCUTTA کے دستخط شدہ دستک پر مال بلا کسی روک ٹوک، بغیر کسی اور ٹیکس کی ادائیگی کے داخل ہوا کریگا۔

کمپنی کے مقروض ہندوستانی، طلبی پر انگریزوں کے حوالہ کر دیے جائیں گے، مرشد آباد کی ٹکسال ہفتہ میں ۳ دن کمپنی کے سکے ڈھالے گی، انگریزوں کو ۳۸ گاؤں ان ہی شرائط پر دے دیے جائیں گے جن پر کالی گھاٹ (KALI GHAT) چھٹانتی (CHUTTANATI) اور گوبند پور کے دیہات دئے گئے ہیں۔ نواب نے ان سب مراعات پر عمل کرنا خلافِ مصلحت سمجھا، بلکہ ان کے نفاذ میں انکار تک کیا، لیکن دہلی سے یہ مراعات حاصل ہونے کے بعد صورت حال اس کے لئے نہایت تشویشناک ہوگئی۔ اور انگریزوں کو اتنا اقتدار حاصل ہوگیا کہ پرتگالی، ارمنی، ایرانی اور ہندو تاجر سب انگریزی جھنڈے کے نیچے تجارت کرنے لگے جہاں برٹش نوآبادیاں تھیں، وہاں انگریزی قانون نافذ تھا۔ اور جس کلکتہ کی آبادی ۱۷۰۴ء میں ۱۵ ہزار نفوس پر مشتمل تھی، ۱۷۵۰ء میں ایک لاکھ سے تجاوز کر گئی اور کلکتہ ایک اہم تجارتی مرکز بن گیا اور اس کی اقتصادی کنجی انگریزوں کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔

مرشد قلی خاں کا انتقال ۳۰ جولائی ۱۷۲۷ء کو ہوا۔ کچھ عرصہ اس کا داماد شجاع الدین برسر اقتدار رہا۔ پھر ۱۷۴۰ء میں علی وردی خاں نواب کی مسند پر آیا اور بنگال، بہار اور اڑیسہ اس کے احاطہ اختیار میں دیے گئے۔ اس نے مغل بادشاہ محمد شاہ سے منشور حاصل کرنے کے لئے ایک کروڑ کا نذرانہ پیش کیا۔ یہ رقم اس ایک کروڑ سالانہ محاصل کے علاوہ تھی جو بنگال دہلی کو بھیجتا تھا۔ علی وردی خاں کامیاب اور باتدبیر حاکم تھا۔ اس کے فوجی کمانڈر مصطفےٰ خاں نے مشورہ دیا کہ انگریزوں کو بنگال سے نکال دیا جائے لیکن اس کا کہنا تھا کہ یورپین تاجر شہد کی مکھیوں کے چھتے کی مانند ہیں، ان سے شہد اس وقت تک حاصل کیا جاسکتا ہے جب تک ان کو چھیڑا نہ جائے۔ ۱۰ اپریل ۱۷۵۶ء کو اسی سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوا۔ اور اس کا پوتا سراج الدولہ جانشین ہوا۔ جن

قوتوں کو علی وردی خاں نے اپنی حکمت عملی سے دبائے رکھا تھا، انہوں نے سر اٹھانے شروع کر دئے۔ علی وردی خاں نے زمینداروں سے جن میں بیشتر ہندو تھے بہت اچھے تعلقات رکھے تھے۔ سراج الدولہ کے زمانہ میں یہ صورت باقی نہ رہی۔ حالات کا رخ بدلا اور نئی دشواریاں نمودار ہونے لگیں۔

یہاں جنگ پلاسی کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں۔ لیکن بعض حقائق کی طرف توجہ دلانا حالات کے تجزیہ میں مددگار ہو سکتا ہے۔

جنگ پلاسی میں فوج کی صورت یہ تھی کہ ۹۵۰ انگریز پیدل سپاہی تھے اور ۱۵۰ توپچی (ARTILLERY MEN) تھے۔ ان کے ساتھ ۲۱۰۰ ہندوستانی سپاہی تھے۔ جن میں تلنگے پٹھان، راجپوت وغیرہ شامل تھے اس طرح یہ کل انگریزی فوج ۳۲۰۰ افراد پر مشتمل تھی لیکن اس تھوڑی فوج نے پورے ملک کا نقشہ بدل دیا۔ اس فتح و شکست میں ان سازشوں کا بڑا دخل تھا جن سے اُس وقت کی ساری فضا مسموم تھی۔ میر جعفر کی غدارانہ حرکتوں نے جس طرح ہندوستان کی سیاسی قسمت بدل دی تھی، اور مسلمانوں کے ذہن پر جو اثر ڈالا تھا، اس کا کچھ اندازہ اقبال کی نظم "ارواح رذیلہ کہ بالملک وملت غداری کردہ دوزخ ایشاں را قبول نہ کردہ" سے ہوتا ہے۔ عالم بالا میں "روح ہندوستان" اس کے خلاف نالہ و فریاد کرتی ہے اور دوزخ بھی ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ "الامان از روح جعفر الامان" کہتے ہیں۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن — ننگ آدم، ننگ دیں، ننگ وطن
ناقبول و ناامید و نامراد — ملتے از کارشاں اندر فساد
در گلشن تخم غلامی را کہ کشت — ایں ہمہ کردار آں ارواح زشت

سیاسی بصیرت اور دور اندیشی کے فقدان، دون ہمتی، باہمی تنازعات اور سازشی مزاج نے بالآخر ملک کو غلامی کی زنجیریں پہنا دیں۔

سراج الدولہ کی شہادت پر راجہ رام نرائن موزوں نے یہ شعر کہا تھا جس میں جذبات کی ایک دنیا سمٹ آئی ہے ؎

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی — دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

انگریزوں نے صرف پلاسی کی جنگ ہی میں کامیابی حاصل نہیں کی، بلکہ جنگ پانی پت کے فوائد بھی سمیٹ لئے اور جنگ بکسر کے بعد تو ان کی حیثیت ایک قانونی اقتدار کی ہو گئی۔ جنگ پلاسی کے بعد انگریزوں کا ملک کے ایک نہایت زرخیز علاقے کے سارے ذرائع پر قبضہ ہو گیا۔ مغلیہ سلطنت کی اقتصادی شہ رگ کٹ گئی۔ انگریزوں کو اپنا اقتدار جمانے میں دو اہم واقعات کے رونما ہونے سے بہت مدد ملی۔ ایک طرف مرہٹوں کے حملے رک گئے، دوسری طرف احمد شاہ ابدالی کے انتقال نے افغانستان میں انتشار اور ابتری پیدا کر دی۔ اب کوئی اندرونی اور بیرونی طاقت ایسی نہ رہی جو انگریزی اقتدار کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکے۔ ۱۷۶۳ء میں نواب میر قاسم نے انگریزوں کے خلاف مہم چلانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

بنگال کی اقتصادی زندگی کی اصل بنیاد زمین ہے، اور اس کی معاون ملازمت۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو مختلف اصلاحات کیں وہ سب کی سب مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہونچانے والی تھیں۔ بندوبست استمراری کے اجرار اور لاخراج زمینوں سے بے دخلی کی بنا پر مالکان زمین یعنی مسلمان تباہ حال اور تنگ دست ہو گئے۔ ملاحظہ ہو بنگلا ادب کی تاریخ ص ۱۹۳ نیز JAYANTI MAITRA MUSLIM POLITICS

IN BENGAL 1855-1906 P.68.

جنگ پلاسی سے پہلے بنگال کی راجدھانی مرشد آباد تھی۔ اور یہی پورے بنگال کی تہذیب و تمدن کا مرکز تھا۔ جب مرکز اقتدار کلکتہ کو منتقل ہوگیا تو مسلمانوں کو دیہاتوں سے نکل کر شہر پہنچنے میں بڑا وقت لگا۔

انگریزی اقتدار کے خلاف بنگال میں سب سے پہلی آواز مسلمان فقیروں نے اٹھائی۔ ان کے سردار مجنوں شاہ نے ۷۷-۱۷۷۶ء میں علم بغاوت بلند کیا اور بنگال کے مختلف علاقوں میں شورش برپا کردی، انہوں نے انگریزی اقتدار کے خلاف جذبات کو برانگیختہ کیا اور آواز لگائی کہ

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری

نیپال کی ترائی میں ان کی تحریک کے دو اہم مرکز تھے، ایک مکوانپور (MAKWANPUR) دوسرا کٹھمنڈو (KATHMANDU)۔ وہاں اپنی قوت کا اجتماع کرکے وہ سارے بنگال میں پھیلنا چاہتے تھے۔ بنگال میں مدار گنج اور بوگرہ ضلع میں مہاستھان (MAHASTHAN) ان کے مرکز تھے۔ مہاستھان میں انہوں نے ایک قلعہ بھی بنالیا تھا۔ مجنوں شاہ کی خاص مقبولیت دیہاتی علاقوں میں تھی۔ گاؤں کے لوگ ان کی جماعت کو پناہ بھی دیتے تھے اور کھانا بھی کھلاتے تھے۔ ۱۷۸۷ء میں مجنوں شاہ کا انتقال ہوا اور ان کے بیٹے چراغ علی شاہ نے ان کی جگہ لی، انہوں نے کام کو اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھایا۔ ہندوؤں کو اپنی تحریک میں شامل کرکے اس کا حلقہ وسیع کردیا۔ بھوانی پاٹھک (BHAWANI PATHAK) اور دیوی چودھرانی (DEVI CHAUDHARANI) نے ان کے ساتھ تعاون کیا۔ ان کی جماعت نے انگریزوں کی فیکٹریوں پر حملے کئے اور سامان، ہتھیار، نقدی پر قبضہ کرلیا۔ جو

لوگ فوج سے علیحدہ کردیے گئے تھے اور اب بیکار تھے ان کو بھی اس تحریک میں شامل کرلیا گیا۔ ۱۷۹۲ء سے ۱۸۰۰ء تک ان کی سرگرمیوں نے کمپنی کی فوجوں کو مصروف اور پریشان رکھا۔ لیکن جب انگریزوں نے مہاراجہ نیپال سے معاہدہ کرلیا تو ان کی تنظیم کے مرکز کمزور پڑ گئے اور فوجی طاقت کو منظم کرنے کا کوئی امکان نہ رہا۔ بایں ہمہ انہوں نے عرصہ تک بغاوت کا جھنڈا بلند رکھا اور ۱۸۱۰ء میں لارڈ منٹو کو تسلیم کرنا پڑا کہ اس تحریک سے مقابلہ کی طاقت گورنمنٹ میں نہیں تھی۔

(J.M. GHOSH, SANYASI AND FAKIR RAIDERS IN BENGAL CALCUTTA 1930)

پھر اسی نوعیت کی ایک تحریک کرم شاہ نے شروع کی۔ ۱۷۷۵ء میں انہوں نے سوسانگ پرگنہ سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو ساتھ لیا۔ ۱۸۱۳ء میں کرم شاہ کے انتقال پر ان کے بیٹے ٹیپو نے قیادت سنبھالی۔ ۱۸۲۵ء میں انہوں نے شیرپور کے زمینداروں پر حملے کئے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنا دربار اور اپنی عدالتیں قائم کرلیں۔ چند سال ان کا اقتدار قائم رہا لیکن ۱۸۳۱ء میں میدانی علاقوں سے اور ۱۸۳۳ء میں پہاڑی علاقوں سے ان کی جماعت کا بیج اکھاڑ پھینکا گیا۔ مورخوں نے شاید ان کے نام بھلا دئے، لیکن آزادی کی شاہراہ انہی کی قربانیوں سے جگمگاتی نظر آتی ہے ؎

جلے جل کر بجھے بھی چشم صورت ہیں یہ پروانے　　فروزاں کر گئے وہ نام لیکن شمع سوزاں کا

بنگال میں جذبات حریت بیدار کرنے میں فرائضی تحریک کا کارنامہ بہت شاندار ہے۔ اس کے بانی حاجی شریعت اللہ (۱۸۴۰-۱۷۸۱) ضلع فرید پور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۷۹۹ء سے ۱۸۱۸ء تک ان کا قیام حجاز مقدس میں رہا۔ JAMESWISE کا خیال ہے (EASTERNBENGAL P-21) کہ ۱۷۶۵ء سے لے کر جب بنگال، بہار

اور اڑیسہ کی دیوانی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہوا، فرائضی تحریک کے شروع ہونے تک، مشرقی بنگال کے مسلمان بالکل اس طرح سے تھے جیسے بغیر گڈریہ کے بھیڑوں کا گلہ۔ نہ انہیں راہ کا پتہ تھا نہ منزل کا علم۔ وہ اپنے دینی عقائد سے دور ہوتے جاتے تھے، اور ایک ذہنی انتشار کے عالم میں زندگی گزارتے تھے۔ حاجی شریعت اللہ کی تحریک نے حالات کا نقشہ بدل دیا۔ وہ غریبوں، مزدوروں اور کسانوں میں خاص طور پر مقبول ہوئے۔ ۱۸۴۰ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے مولوی محمد محسن عرف دو دو میاں نے تحریک کو سنبھالا۔ اور اس میں ایک نئی قوت، نیا عزم اور نیا فکری انقلاب پیدا کر دیا۔

فرائضی تحریک پر زمانۂ حال کے مورخین نے خاصا کام کیا ہے، لیکن اب تک کوئی محقق وہ انکشافات کرنے میں کامیاب نہیں ہوا جو مولانا غلام رسول مہر نے تحریک مجاہدین کے سلسلہ میں دستاویزی جعل سازیوں کو بے نقاب کرکے انجام دی ہیں۔ اور تحریک آزادی میں مجاہدین کے کارناموں کو واضح کر دیا ہے۔ ہنوز فرائضی تحریک کی حقیقی نوعیت سامنے نہیں آسکی۔ حاجی شریعت اللہ کی روح آج تک یہ کہتی ہوئی سنائی دیتی ہے ؎

آشکارم دید و پنہانم نہ دید

فرائضی تحریک کو محدود فقہی مسائل کے دائرہ میں دیکھنا، طریقہ محمدیہ اور وہابی تحریکوں کے اختلافات کے پس منظر میں پیش کرنا، یا محض زمینداروں کے خلاف محدود تحریک بنا کر اس کا تجزیہ کرنا صحیح ہو سکتا ہے لیکن تحریک کے حقیقی خد و خال کو واضح نہیں کرتا۔ اس تحریک کا دائرہ وسیع تھا اور ہر نوع کے حالات کا نتیجہ تھا۔ اس کے پہلو مذہبی بھی تھے، سیاسی بھی اور اقتصادی بھی۔ بنگال میں حریت و آزادی کی یہ وہ صدا تھی جس نے وہ احساس و شعور بیدار کیا۔

جس کے بغیر کوئی آزادی کی تحریک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ دودو میاں کے خلاف مقدمہ میں DAMPIER کمشنر بنگال پولیس نے اپنے بیان میں بالکل واضح طور پر کہا تھا کہ اس تحریک کا مقصد انگریزوں کو ملک سے نکالنا تھا۔ (TRIAL OF DUDU MIYAN APPENDIX P.P. XXVII-XXIV)

فرائضی تحریک کے بعض انقلابی پہلوؤں کی طرف توجہ دلانی ضروری ہے۔

(۱) انہوں نے اعلان کیا کہ "الارض للہ" یعنی زمین خدا کی ملکیت ہے اور کسی کو حق نہیں کہ بطور وراثت اس پر قابض ہو۔ اقبال نے سچ کہا ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب ۔۔۔ بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمین

اس تصور کا ایک پہلو یہ تھا کہ جو لوگ کھیتی کرتے ہیں وہی اس کے مالک ہیں، کسی کو لگان وصول کرنے کا حق نہیں۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ ملک پر غیر ملکی قبضہ غاصبانہ ہے اور تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) انہوں نے اعلان کیا کہ ہندوستان دار الحرب ہے۔ یہ جذبۂ آزادی کو ایک شعلہ بنا دینے کے مترادف تھا۔ مسئلہ صرف نماز جمعہ و عیدین کا نہ تھا، یہ صدائے بازگشت تھی اس فتوی کی، جو حضرت شاہ عبد العزیزؒ نے دہلی میں دیا تھا اور جس کے سایے میں جذبات حریت نے پرورش پائی تھی۔

(۳) فرائضی تحریک نے دیہاتی آبادی میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں ان کو زمینداروں کے خلاف بھی محاذ بنانے پڑے لیکن حقیقی مقصد یہی تھا کہ آزادی کی لہر دیہات سے شہروں میں آئے تاکہ اثرات اور عواقب کا دائرہ محدود نہ رہے۔

(۴) متوازی حکومت کے تصور کو فرائضی رہنماؤں نے عملی شکل دی اور تقویت

پہونچائی۔ انہوں نے کسانوں کو منظم کیا، پنچائتیں قایم کیں، اور ایک مستقل نظام حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ فریدپور اور باری سال کے اضلاع کو مختلف علاقائی حصوں میں تقسیم کرکے دودو میاں نے، اپنے خلیفہ مقرر کئے۔ ان علاقوں پر ان کا اقتدار انیسویں صدی کے وسط تک قایم رہا۔

(۵) دودو میاں نے مقامی ہندوؤں کے تعاون سے اپنی تحریک کو ایک ہمہ گیر اقتصادی تحریک کی شکل دے دی۔ بنگال میں زمینداروں کے مظالم، نیل کی کاشت کے مسائل، مختلف مفادات کے تصادم نے صورت حال کو اتنا گھمبیر بنا دیا تھا کہ بڑے تحمل تدبر اور انتظامی صلاحیت سے ہی ان کا مقابلہ کیا جاسکتا تھا۔ دودو میاں نے ان مسائل کا مقابلہ جس طرح کیا اس سے ان کی دور اندیشی اور تدبر کا اندازہ ہوتا ہے۔

فرائضی تحریک کے بعد جس تحریک نے بنگال کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد تھی۔

مولانا شہیدؒ نے گو اپنی تحریک میں مسلمانوں کی دینی زندگی کی اصلاح کو خاص اہمیت دی تھی، لیکن ان کا اہم ترین مقصد انگریزوں کو ملک سے نکالنا تھا۔ راجہ ہندو راؤ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

برائے رائے عالی روشن ومبرہن	جناب کو خوب معلوم ہے کہ پردیسی
است کہ بیگانگاں بعید الوطن، ملوک	سمندر پار کے رہنے والے دنیا
زمین و زمن گردیدہ اند، و تاجراں	جہاں کے تاجدار اور یہ سودا بیچنے
متاع فروش بپایہ سلطنت رسیدہ،	والے سلطنت کے مالک بن گئے
امرائے کبار و ریاست رؤسائے عالی	ہیں۔ بڑے بڑے امیروں کی امارت

مقدار برباد نمودہ اند، و عزت و	اور بڑے بڑے اہل حکومت کی حکومت
اعتبار شاں بالکل ربودہ، چوں اہل	اور ان کی عزت وحرمت کو انہوں نے
ریاست و سیاست در زاویہ خمول	خاک میں ملا دیا ہے۔ جو حکومت و سیاست
نشستہ اند ناچار چندے اہل فقر و	کے مرد میدان تھے وہ ہاتھ پر ہاتھ
مسکنت کمرہمت بستہ ایں جماعت	دھرے بیٹھے ہیں اس لئے مجبوراً
ضعفا محض بنا بر خدمت دین	چند غریب و بے سروسامان کمرہمت
رب العالمین برجستند، ہرگز ہرگز	باندھ کر کھڑے ہو گئے اور محض اللہ
از دنیاداران جاہ نیستند، محض	کے دین کی خدمت کے لئے اپنے
بنا بر خدمت دین رب ذوالجلال	گھروں سے نکل آئے۔ یہ اللہ کے
برخاستہ اند، نہ بنا بر طمع مال و	بندے ہرگز دنیادار اور جاہ طلب نہیں
منال، وقتے کہ میدان ہندوستان	ہیں محض اللہ کے دین کی خدمت
از بیگانگاں و دشمنان خالی گردید	کے لئے اٹھے ہیں، مال و دولت
و تیر سعی ایشاں بر ہدف مراد	کی ان کو ذرہ برابر طمع نہیں، جس
رسیدہ آئندہ مناصب ریاست	وقت ہندوستان ان غیر ملکیوں
و سیاست بطالبین آں مسلم باد"	سے خالی ہو جائے گا اور ہماری
(مولانا ابوالحسن علی ندوی۔	کوششیں بارآور ہو گئیں حکومت کے
"مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا	عہدے اور منصب ان لوگوں کو ملیں گے
نقصان پہونچا" ص ۲۷۴-۲۷۳)	جن کو ان کی طلب ہوگی"۔

اس خط کے آخری جملہ پر اقبال کا یہ شعر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے۔

شہادت ہے مقصود و مطلوب مومن　　نہ مال غنیمت، نہ کشور کشائی

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے "منصب امامت" میں اعلان کیا تھا:

"اطاعت ہر متسلط از احکام شرعیہ نیست (ص ۹۸)　　ہر صاحب اقتدار کی اطاعت کرنا حکم شریعت نہیں ہے۔

بنگال میں سید احمد شہیدؒ کی تحریک نے ایسی روح پھونک دی جو پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ:

"ان کی آواز ہمالیہ کی چوٹیوں اور نیپال کی ترائیوں سے لے کر خلیج بنگال کے کناروں تک یکساں پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق اس علم کے نیچے جمع ہونے لگے۔"

(سیرت سید احمد شہیدؒ: مولانا ابوالحسن علی ندوی)

حد یہ ہے کہ مومنؔ جیسا شاعر یہ تمنا کرنے لگا:

الٰہی! مجھے بھی شہادت نصیب　　یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

ہندوستان کی تاریخ میں جان فروشی اور قربانی کا ویسا جذبہ کبھی نظر نہیں آیا جب در و دیوار سے یہ صدائیں آتی تھیں ؎

جو داخل سپاہ خدا میں ہوا　　فدا جی سے راہِ خدا میں ہوا

حبیب حبیب خداوند ہے　　خداوند اس سے رضامند ہے

امام زمانہ کی یاری کرو　　خدا کے لئے جاں نثاری کرو

سید احمد شہیدؒ جب ۱۲۳۷ھ میں کلکتہ پہونچے تو یہاں ایک آگ لگادی۔ سرسید کا بیان ہے کہ:

"شہر کلکتہ میں جب تک آپ نے تشریف رکھی شراب مطلق نہ بکنے پائی اور کلال خانے

بند رہا۔ اور اُس نواح میں آپ کے مریدوں کی کثرت لکھوک سے گزر گئی۔"

(آثار الصنادید)

ان کی آواز میں وہ سوز اور درد تھا کہ بنگال کی ساری زمین ہلنے لگی۔ یہاں تقریباً ساڑھے تین یا پونے چار مہینے ٹھہرے۔ پرنسپ (RANJIT SING P.146) نے لکھا ہے کہ کلکتہ کے باشندوں کی بڑی تعداد ان کی پیرو ہوگئی۔ ٹیپو سلطان کے خاندان کے بعض افراد یہاں مقیم تھے، ان کے خیالات کی اصلاح کی۔ سلہٹ، چٹ گام اور آسام وغیرہ سے لوگ بذریعہ کشتی کلکتہ پہنچے۔ اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ وہ لوگوں کو عمامہ، کُرتے وغیرہ عنایت فرماتے تھے اور مختلف علاقوں میں گھوم گھوم کر تعلیم دینے کا حکم دیتے تھے۔ کلکتہ سے یہ قافلہ حج کے لئے روانہ ہوگیا، لیکن جو آگ انہوں نے دلوں میں لگادی تھی وہ مدتوں سرد نہیں ہوئی۔ سرسید کا بیان ہے کہ ان کی شہادت کے چودہ پندرہ سال بعد تک مجاہدین، جہاد کے جذبے سے سرشار، سرحدی علاقوں میں "بہ نیت جہاد" جاتے رہے۔ بنگال میں ان کی پھونکی ہوئی روح مدتوں کام کرتی رہی۔

سید صاحبؒ کے ایک مرید اور خلیفہ میر نثار علی عرف تیتومیر نے بنگال میں جذبات آزادی کو فروغ دینے میں بہت شاندار کام انجام دیا۔ انہوں نے مغربی بنگال کے چوبیس پرگنہ اور ندیا کو مرکز بنا کر اپنی تحریک کو آگے بڑھایا۔ ان کا تعلق چاند پور کے ایک خوشحال گھرانے سے تھا۔ ابتدائی زندگی کا رنگ کچھ اور تھا لیکن مظلوموں کی مدد کا جذبہ اس وقت بھی ان کا امتیازی وصف تھا۔ ایک زمیندار سے جھگڑا ہوا اور سزا ہوگئی، رہائی پر حج کا ارادہ کر دیا۔ وہاں سید صاحبؒ سے ملاقات ہوئی اور بامقصد زندگی گزارنے کا جذبہ بجلی کی طرح رگ و پے میں کوندنے لگا۔ ۱۸۲۷ء میں وطن واپس آئے اور تحریک کی تنظیم اور اپنے

خیالات کی نشر و اشاعت میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ سید صاحبؒ یہاں تخم ریزی پورے طور پر کر گئے تھے۔ تیتو میاں نے اس سے فائدہ اٹھا کر اپنی تحریک کا دائرہ اثر و نفوذ وسیع کر لیا۔ اکتوبر ۱۸۳۱ء میں نرکل بریا میں بانسوں کی ایک مضبوط فصیل بنائی۔ اور اعلان کر دیا کہ "ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہو گئی۔ انگریزوں نے ظلم سے بنگال پر قبضہ کر کے مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ کیا تھا۔ اب مسلمانوں نے اپنا اقتدار واپس لے لیا ہے۔"

ہنٹر کے بیان کے مطابق ان مجاہدین کی تعداد تین چار ہزار تھی۔ غلام معصوم ان کے سالار تھے۔ ۱۴ر نومبر ۱۸۳۱ء کو ALEXANDER نے نرکل بریا پر حملہ کیا۔ غلام معصوم نے اس حملہ کو پسپا کر دیا اور ALEXANDER مشکل سے اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگا۔ پھر ایک انگریز زمیندار نے جو نیل کی کاشت کرتا تھا، تین سو سپاہی لے کر حملہ کیا، لیکن اس کو بھی شکست فاش ہوئی۔ اب انگریزوں کو فکر ہوئی اور کلکتہ سے ایک فوج بھیجی گئی جس کے پاس حملہ کرنے کے لئے توپیں بھی تھیں۔ تیتو میاں نے ۶۰۰ آدمیوں کو ساتھ لے کر بہادری سے مقابلہ کیا۔ لیکن توپوں کے مقابلے میں کیا کر سکتے تھے۔ تیتو میاں لڑتے ہوئے شہید ہوئے اور ان کے پچاس ساتھیوں نے بھی وہیں جان دی۔ غلام معصوم اور ۳۵۰ مجاہدین کو زندہ گرفتار کر لیا گیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ ادھر ۱۸۳۱ء میں مجاہدین کے قافلہ سالار مولانا سید احمدؒ بالا کوٹ میں شہید ہوئے اور میدان کارزار لاشوں سے پٹ گیا، ادھر بنگال میں نرکل بریا کے میدان میں مجاہدین کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ جو مجاہدین بچ گئے ان کو علی پور جیل میں قید کیا گیا اور ان پر مقدمات چلائے گئے۔ غلام معصوم کو سزائے موت دی گئی۔ بقیہ مجاہدین ابتلا و مصائب

سے دوچار، نہ معلوم کس طرح ختم کر دیئے گئے۔ ؎

پھر نہ کچھ دیکھا بجز یک شعلۂ پر پیچ و تاب　　شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

بنگال میں تحریک آزادی کی کوئی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک فرائضیوں اور مجاہدین کی جد و سعی کی پوری کیفیت نہ بیان کی جائے۔ ان کی قربانیوں نے جد وجہد آزادی کا ماحول پیدا کیا، سرفروشی کے جذبات کو فروغ دیا اور جان دینے کا سلیقہ سکھایا۔

۱۸۵۷ء اور بنگال

بنگال میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے پس منظر میں عجیب و غریب محرکات ذہنی کام کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف شاہ نعمت اللہ ولیؒ کے قصائد کے بے شمار بنگالی اور اردو ترجمے مسلمانوں میں تقسیم ہو رہے تھے، اور یہ پیشین گوئی کی جا رہی تھی کہ انگریزوں کا اقتدار سو سال کے لئے تھا، اس کے خاتمہ کا وقت آ گیا۔ دوسری طرف انگریز جنگ پلاسی کی صد سالہ یادگار منانے کی تیاری کر رہے تھے۔ لیکن حالات نے دوسرا ہی رخ اختیار کر لیا۔ اور جو آگ سینوں میں دبی ہوئی تھی، وہ شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ بنگال کے حالات کے پیش نظر انگریزوں کو بہت تشویش تھی، اور بڑے خطرات یہاں نظر آ رہے تھے۔ لفٹننٹ گورنر نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ شاید ہی بنگال کا کوئی ضلع ایسا ہو جہاں شدید قسم کے خطرات محسوس نہ ہوتے ہوں۔ ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ ۱۴ر جون کو سپاہیوں کی بغاوت کو سن کر بنگال میں انگریز افسروں پر ایسی دہشت طاری ہو گئی تھی کہ وہ دروازوں کو بند کئے، بھرے ہوئے پستول ہاتھ میں لئے صوفوں پر سوتے تھے۔ بعض نے تو بھاگ کر جہازوں میں پناہ لے لی تھی۔ (KAYE AND MALLESON III P. 16-17)۔ واجد علی شاہ اس وقت کلکتہ میں تھے، ان پر بھی باغیوں کو ابھارنے

کاشبہ تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں بنگال میں اتنے شدید دھاکے نہ ہو پائے جتنے اور علاقوں میں ہوئے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ دوری اور وسائل کی کمی کے باعث دہلی کے مجاہدین آزادی کلکتہ سے رابطہ قائم نہ کر سکے۔ کنہیالال نے لکھا ہے کہ دہلی سے صرف تین آدمی کلکتہ مجاہدین آزادی کے نمائندوں کے طور پر بھیجے گئے تھے۔ ان کو کتنی کامیابی ہوئی اور ان کا کیا حشر ہوا، اس کی تفصیل نہیں ملتی۔

انگریزوں نے سب سے پہلے دودو میاں کو حراست میں لیا۔ انہوں نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ۵۰ ہزار آدمی ان کی ایک آواز پر جمع ہو سکتے ہیں۔ انگریز ان سے بے حد خائف تھے۔ اور سوچتے تھے کہ کوئی عوامی تحریک ان کے گرد منظم نہ ہو جائے۔ ان کو ۱۸۶۰ء تک علی پور جیل میں رکھا گیا۔ ۱۸۶۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔

سب سے پہلے CHITTAGONG کے سپاہیوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ ۱۸ نومبر ۱۸۵۷ء کو 34 REGIMENT-N.I نے بیرک چھوڑ دئے، مکانوں کو آگ لگا دی اور خزانہ پر قبضہ کر لیا۔ ان باغیوں کے سربراہ راجہ علی خاں تھے جو 4TH COM-PANY میں PAYHAVILDER تھے۔ باغی بچتے بچاتے SINGAR HILL (COMILLA Z.) کے شمال میں تھا) پہونچ گئے۔ یہ راستہ سخت دشوار گزار تھا، اور بے پناہ مصائب سے ان کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ جب اس باغی دستہ کے سلہٹ پہونچنے کی خبر ملی تو MAJOR BYNG ان کے تعاقب میں روانہ ہوا لیکن جنگ میں مارا گیا ۲۶ آدمی باغی دستہ کے مرے- اور اس بقیہ جماعت کو ایک مہینہ منی پور کے جنگلوں میں گزارنا پڑا۔ یہ لوگ اپنے وسائل کو جمع کر کے، پھر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک ۲۲ جنوری ۱۸۵۸ء کو انگریزوں نے حملہ کر دیا۔ جان بچا کر بہت مشکل سے یہ لوگ نکل سکے۔ پہاڑی علاقہ میں محصور ہونے کے

باعث بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں۔ لیکن انہوں نے بہادری سے لڑتے ہوئے جانیں دیں۔

(KAYE AND MALLESON, IV P. 297.)

ڈھاکہ میں جب بغاوت کی خبریں پہونچیں تو LT. LEWIS نے ہندوستانی سپاہیوں سے ہتھیار رکھوائے۔ باغی سپاہیوں پر حملے کئے لیکن وہ مختلف سمتوں میں منتشر ہو گئے۔ اور بھوٹان میں عارضی طور پر پناہ گزیں ہو گئے۔ انقلابیوں کے اہم اور انگریزوں کے ۱۸ آدمی اس معرکہ میں ختم ہوئے۔ انگریزوں نے شدید مظالم کئے کچھ کو سولی پر چڑھایا۔ کچھ نے دریا میں ڈوب کر جان دے دی۔

ڈھاکہ سے انقلابی JALPAIGORI کی طرف متوجہ ہوئے اور GEORGE E YULE کمشنر نے ان کا پیچھا کیا لیکن وہ دارجیلنگ کی طرف نکل گئے۔ ڈھاکہ کے مجسٹریٹ C. JENKINS کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ 73 REGIMENT OF NATIVE INFANTRY میں کل ۱۲ مسلمان تھے۔ اس ریجمنٹ نے بعد کو بغاوت کی۔

نیل کی کاشت کرنے والے یورپین زمینداروں کے خلاف اسی زمانہ میں زبردست بغاوت ہوئی، اور ۱۸۶۰ء تک جاری رہی۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔ بعد کو اس تحریک نے PEASANT MOVEMENT، کرشک اندولن KRISHAK ANDOLAN کی شکل اختیار کر لی۔

جب انگریزوں نے حالات پر قابو پالیا، تو سزاؤں کا سلسلہ شروع ہوا جو دار و رسن سے بچے وہ انڈمان بھیجے جانے لگے۔ یہ سب مجاہدین کلکتہ ہو کر جاتے تھے۔ سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مفتی مظہر کریم دریابادی مولانا فضل حق

خیرآبادی وغیرہم اسی راہ سے گزرے۔ ناممکن تھا کہ ان کی داستان غم والم دلوں میں ہیجان نہ پیدا کردے۔ منیر شکوہ آبادی اس طرح کلکتہ پہونچے کہ :

پھر ہوئے کلکتہ کو پیدل رواں   گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے
ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں   ناتواں ترقیس کی تصویر سے

۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ناکامی کے بعد تحریک آزادی کا انداز، رخ اور طریقۂ کار بدل گیا۔ بنگال میں سو سال کے اندر ایک زبردست سماجی تبدیلی رونما ہوچکی تھی۔ مغلیہ دور کے امراء کی حکمراں جماعت بالکل معدوم ہوچکی تھی۔ ایک نئی نسل، انگریزی اثرات سے پوری طرح رنگی ہوئی وجود میں آگئی تھی۔ اس طبقہ نے اپنا مفاد اسی میں دیکھا کہ انگریزوں کا ساتھ دیا جائے۔ دہلی اور بنگال کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ اور مقامی حالات اب پہلے سے زیادہ تحریکوں اور انداز فکر پر اثر ڈالنے لگے۔ ایک حقیقت جو واضح طور پر سامنے آئی وہ یہ تھی کہ ایک ایسا طبقہ وجود میں آئے جو نئے علوم سے واقفیت رکھتا ہو، جو اپنی صلاحیتوں سے مغربی طریقہ کار کا جواب دے سکے، جس میں آئینی جدوجہد کی صلاحیت ہو، جو حکومت کے دفاتر میں پہونچ جائے، جو جذبات حریت کو بیدار کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو، جو خواب گراں سے جگا بھی سکے۔ کمپنی نے اپنی طاقت کا استحکام جغرافیائی سہولتوں کو مدنظر رکھ کر کرلیا تھا۔ خود ہندوستانیوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا تھا جس کے بہت سے مفاد انگریزی اقتدار سے وابستہ تھے اور وہ بالواسطہ اس کی طاقت کو تقویت پہونچا رہا تھا۔ مسلمانوں کا عالم اس وقت بالکل دوسرا تھا۔ انہوں نے اب تک جنگ آزادی میں اپنی بساط سے بڑھ کر حصہ لیا تھا۔ فرائضی، وہابی، مجاہدین وغیرہ کی تحریکیں راہ آزادی میں بہت عزم اور ہمت کا مظاہرہ تھیں، لیکن اب حالات نے ایسی کروٹ لی تھی کہ مسلمانوں کی

اقتصادی حالت تباہ تھی، تعلیم کا حال ابتر تھا۔ BLOCHMANN نے جو کلکتہ مدرسہ میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے، ۱۹ اکتوبر ۱۸۷۱ء کو پرنسپل SUTELIFFE کو ایک خط میں لکھا کہ بنگال میں ہر جگہ مسلمان "انقلاب زمانہ" اور "گردش روزگار" سے پریشان ہیں اور ان کو "اشراف گردی" کی شکایت ہے۔

ان حالات میں صرف دو طریقۂ کار تحریک آزادی کو آگے بڑھانے میں مددگار ہو سکتے تھے۔ ایک آئینی اور تعلیمی۔ دوسرا انقلابی اور تشددی۔

ایسی ہی صورت حال سے دوچار شمالی ہندوستان میں سرسیدؒ نے سیاست سے علیحدہ رہ کر مغربی علوم کے حصول پر اپنی توجہ مرکوز کردی تھی۔ بعض کوتاہ اندیشوں نے ان کی اس حکمت عملی کو غلط سمجھا اور ان پر تنقید کی۔ پنڈت جواہر لال نہرو غالباً واحد مدبر تھے جنہوں نے سرسیدؒ کی اس پالیسی کے دور رس نتائج کو سمجھا اور اس کو صحیح انقلابی سمت قرار دیا۔ سرسیدؒ کا خیال تھا کہ اعلیٰ تعلیم ہی کے ذریعہ سیاسی حقوق حاصل کئے جاسکتے ہیں اور اسی کی مدد سے آئینی جنگ لڑی جاسکتی ہے۔ انہوں نے ۱۸۳۱ء اور ۱۸۵۷ء کی جنگوں کو ناکام ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ۲۹ جنوری ۱۸۸۴ء کو امرتسر میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

"اگر گورنمنٹ نے ہمارے کچھ حقوق اب تک ہم کو نہیں دئے ہیں جن کی ہم کو شکایت ہو تو بھی ہائی ایجوکیشن وہ چیز ہے کہ خواہ مخواہ طوعاً و کرہاً ہم کو دلادے گی۔"

مولانا محمد علیؒ نے جب سرسیدؒ کی روح کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا سہ

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا   جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

تو سرسیدؒ کی فکر کی انقلابی سمت کو پوری طرح واضح کردیا تھا۔

کلکتہ میں سرسیدؔ کی طرح اصلاح و تجدید اور تعلیمی ترقی و اصلاح کی تحریک نواب
عبداللطیف (1828 - 1893) اور سید امیر علی (1849 - 1928) کی کوششوں
کی رہینِ منت ہے۔ نواب عبداللطیف نے مسلمان طلبا میں مغربی تعلیم پھیلانے کے لئے
۱۸۶۳ء میں MUHAMMADAN LITERARY SOCIETY قائم کی۔ سیدؔ
امیر علی نے ۱۸۷۹ء میں CENTRAL MUHAMMADAN ASSOCIATION
کی بنیاد ڈالی۔ ان کی کوشش تھی کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان جو اقتصادی اور
تعلیمی عدم توازن پیدا ہو گیا تھا، اس کو دور کیا جائے، تاکہ دونوں ایک ہی سطح پر کھڑے
ہو کر آزادی کی جدوجہد میں حصہ لے سکیں۔

۶ / اکتوبر ۱۸۶۳ء کو سرسیدؔ کلکتہ پہونچے اور نواب عبداللطیف خاں کے مکان
پر فارسی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا:

"پس در تمام مملکت ہند از خلیج بنگالہ تا رودِ سندھ صرف ہمیں شما بزرگانید
کہ دار الامارۃ عہد ما بذات ستودہ صفات شما نازش است و بس۔ آرے اگر
شما ہم در صلاح و فلاح ہم کیشاں و ہم کشوراں خود سعی نہ نمائید باز کدام کس
پرسانِ حال ما محنت برگشتگان خواہد بود۔" (لیکچرس ص ۲۲)

اس آواز میں بڑا درد تھا اور بڑی گیرائی۔ غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ نواب عبداللطیف
نے MUHAMMADAN LITERARY SOCIETY کی بنیاد ڈالی۔ سرسید کی
دور بین نگاہوں نے دیکھ لیا تھا، اور نواب عبداللطیف کے سامنے بھی بنگال کی پوری
تاریخ تھی، کہ جب تک انگریزی تعلیم قوم میں عام نہ ہوگی، کوئی تدبیر حصولِ آزادی کی
سود مند نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے تحریک مجاہدین کا انجام دیکھا تھا، ۱۸۵۷ء میں

موجِ خون سے گزرے تھے۔ ان میں یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ سب سے پہلے تعلیم
کی طرف توجہ ضروری ہے۔ اس کے بغیر اصلاحِ حال کی کوئی صورت کارگر نہیں ہو سکتی۔
اور سیاسی اقتدار کی بازیافت کا خواب تو کبھی شرمندہ تعبیر ہی نہیں ہو سکتا۔ سرسیدؔ
نے جب سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تو نواب عبداللطیف کو اس میں خاصی اہم جگہ دی۔
اور بنگال سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔

حالات کا ایک پہلو اور بھی تھا۔ فرائضی تحریک کے کمزور پڑنے کے بعد عیسائیوں
اور مشنریوں کی کارروائیاں تیز تر ہو گئی تھیں، اس صورت حال کے مقابلہ کے لئے
بنگال کے بعض فضلا نے جن میں منشی مہر اللہ، شیخ عبدالرحیم، مولانا محمد غلام رحمٰن
وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، بڑی جدوجہد کی تھی۔ منشی مہر اللہ (1861-1907)
نے "عیسائی باکرشتاتی دھا کا بھنگن" (عیسائیوں کا فریب پارہ پارہ) لکھ کر ان کے
عزائم کو بے نقاب کیا۔ ان کی کئی کتابیں "رد کرسٹان" "اکرسٹان دھرمیر اشارتا"
(مذہب عیسائیت کی بے حقیقتی) اس سلسلہ میں بہت سود مند ثابت ہوئیں۔ انہوں
نے مذہبی انداز میں انگریزوں کے خلاف جذبات برانگیختہ کئے۔ اور ان خطرات سے
آگاہ کیا جو مشنری تحریکوں سے پیدا ہو گئے تھے۔

ان حالات میں انگریزوں نے ضروری سمجھا کہ مسلمانوں میں تحفظ اور ہندوؤں
میں اختلاف کے جذبات کو فروغ دیا جائے تاکہ تحریکِ آزادی میں ان کا اشتراک عمل
ممکن نہ ہو سکے۔

تقسیم بنگال (۱۹۰۵) اس طریقۂ فکر کی ایک کڑی تھی۔ لارڈ کرزن کا مقصد اختلافات
کو ایسا رنگ دے دینا تھا کہ اتحاد قومی کی بنیادیں ہل جائیں۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ

جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام سرِفہرست ہے اس کو اچھا نہیں سمجھتا تھا، لیکن عوامی ذہن پر موافقت اور مخالفت کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ ہندوؤں نے ۶ سال مسلسل اس کے خلاف جدوجہد کی اور بالآخر اس کو منسوخ کرا لیا۔ مسلمانوں کے ذہن پر اس کا یہ اثر پڑا کہ انہوں نے بھی احتجاجی سیاست کو اپنانا شروع کر دیا۔

انگریزوں کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی حکمت عملی کا اندازہ مسلمانوں کو ہو گیا تھا۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں مسلمان لیڈروں کا ایک کنونشن نواب سلیم اللہ نے بلایا اور ۳۰ دسمبر کو مسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔ جس کا ایک مقصد یہ تھا۔

TO PREVENT THE RISE OF ANY HOSTILITY
TOWARDS OTHER COMMUNITIES.

بنگال میں انقلابی اور دہشت انگیز تحریکوں نے اس وقت جنم لیا۔ شری اروبند گھوش کے اخبار KARMAYOGN نے بیداری کا صور پھونکا۔ مولانا ابوالکلام آزاد بھی اس تحریک میں شری اروبند گھوش اور شری شیام سندر چکرورتی کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اس وقت عام طور پر خیال یہ تھا کہ مسلمان انگریزوں کے مددگار بن گئے ہیں اور انقلابیوں میں بقول مولانا آزاد (A.5) مسلمانوں کی طرف سے ایک بے اطمینانی اور عدم اعتماد کی کیفیت تھی۔ مولانا نے اس خیال کو دور کیا اور ان کی تجویز اور اصرار پہ انقلابی سوسائٹی کی شاخیں ملک کے اور حصوں میں قائم ہوئیں۔

تحریک آزادی کا ایک لازمی جزو عوام کے سیاسی شعور کی بیداری اور اظہار رائے پر پابندیوں کے خلاف احتجاج تھا۔ اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال اور البلاغ نے اور مولانا محمد علی جوہر کے کامریڈ نے جو خدمات انجام دیں وہ

تاریخ آزادی میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ انہوں نے آزادی کی لہر سارے ملک میں دوڑا دی۔ ان دونوں نے اپنی صحافتی زندگی کے معرکے ہی نہیں، بلکہ اپنی سیاسی جدوجہد کی بیشتر جنگیں اسی سرزمین پر لڑیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے جب الہلال جاری کیا تو اعلان کیا کہ اس کی اشاعت "ہمارے قدیمی ارادوں کے سفر کا آغاز ہے"۔ وہ بقول خود برسوں سے "بغیر دھوئیں کے جل رہے تھے۔" اعلان کرتے ہیں۔

"قوموں کی پولیٹکل جدوجہد اور حقوق طلبی کی زندگی میں تو طاقت کے سوا اور کوئی سوال ہے ہی نہیں" (الہلال ۸ر اگست ۱۹۱۲ء)

پھر کہتے ہیں:

"میں نے الہلال مرحوم کے صفحوں کو کبھی اپنے چشم خونیں کے آنسوؤں سے رنگا ہے اور کبھی اس کے سواد و حروف کے اندر اپنے دل و جگر کے ٹکڑے بچھا دئے ہیں۔ ۱۹۱۱ء سے لے کر آج تک یہ مقصد میرے دل کی تمناؤں اور آرزوؤں کا مطلوب اور میری روح کی عشق و شیفتگی کا محبوب رہا ہے۔ خدا کی کوئی صبح مجھ پر ایسی طلوع نہیں ہوئی جب اس مقصد کی طلب سے میرا دل خالی ہوا ہو اور کوئی شام مجھ پر ایسی نہیں گزری جب میں نے اس کی تمنا میں اپنے بستر غم و اندوہ پر بے قراری کی کروٹیں نہ بدلی ہوں۔ میں نے اپنی آزادی کی تمام فرصت اسی کے عشق میں بسر کی اور نظربندی کے چار سال بھی اسی کے فراق میں کاٹے۔"

یہ آزادی وطن کی طلب اور حصول آزادی کی بے چینی تھی جس نے مولانا آزاد کو

ذہنی اور قلبی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنی ساری صلاحیتیں حصول آزادی کی جد وجہد میں لگادی تھیں۔ ۲۲-۱۹۲۱ء میں وہ علی پور جیل میں قید کئے گئے۔ یہ وہی جیل تھی جس کے ایک ایک پتھر پر مجاہدین کے غم واندوہ کی داستانیں نقش تھیں۔ تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا اور پچاس سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ ایک اور مجاہد آزادی یہاں کاروانِ رفتہ کے نقوش کی تلاش کرنے لگا۔ اس کا ریشہ ریشہ پکارتا تھا۔

خون میں گرمیٔ ہنگامۂ منصور ہے آج
ہمیں معلوم یہاں دار و رسن ہے کہ نہیں

۱۱ مارچ ۱۹۲۲ء کو ایک بیان میں کہا:

"پیغمبر اسلام نے فرمایا" سب سے بہتر موت اس آدمی کی موت ہے جو کسی ظالم حکومت کے سامنے حق کا اظہار کرے اور اس کی پاداش میں قتل کیا جائے"۔

یہ صدائے بازگشت ہے اس ذوق جہاد کی جو سید احمد شہیدؒ اور مجاہدین نے پیدا کیا تھا اور جس کی صدائیں اب بھی حساس روح سن سکتی تھی۔ پھر ایک تقریر میں کہا:

"میں وہ صور کہاں سے لاؤں جس کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خواب غفلت سے بیدار کر دے۔"

ان کی آواز نے ایوانِ حکومت میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ الہلال نے قومی جذبات کی بیداری اور آزادی کی جد وجہد میں جو گراں بہا خدمات انجام دی ہیں ان کو کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اور یہ سب آوازیں کلکتہ سے اٹھی تھیں۔

مولانا آزاد نے ۱۹۱۳ء میں حزب اللہ کی بنیاد ڈالی۔ اس کا مقصد ایک ایسی جماعت کا تیار کرنا تھا جو آزادی کے لئے اپنی جان ہتھیلی پر لیکر میدان میں داخل ہو سکے۔

اسی زمانہ میں انہوں نے بدیشی اشیاء کے بائیکاٹ کی تلقین شروع کی۔ ایک

مضمون میں کہتے ہیں:

"پس اگر مسلمانان ہند اس وقت اپنی قوت سے کوئی نتیجہ خیز کام لینا چاہتے ہیں تو برائے خدا حالت کی نزاکت کو محسوس کریں اور میدانِ کار میں چند قدم آگے بڑھائیں۔ اس سلسلے میں پہلا کام ان کا یہ ہے کہ حتی الامکان تمام یوروپین مال تجارت اور مصنوعات کا بائیکاٹ کر دیں۔" (بائیکاٹ ص ۱۰)

مولانا محمد علی" کے کامریڈ نے آزادی رائے اور حقوق طلبی کی جو آواز اٹھائی اس کے اثرات پورے ملک میں محسوس ہوئے۔ انہوں نے اکتوبر، نومبر ۱۹۱۲ء کے کامریڈ میں جو مضامین لکھے تھے ان میں آگ کے شعلے جلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جب ترک موالات اور سودیشی کی تحریک کا آغاز ہوا تو مولانا محمد علی پکار اٹھے۔

"صلوٰۃ عشق کا وضو خون سے ہوتا ہے۔ آپ سوراج کے سچے عاشق ہیں تو اس نماز کا وضو کرنے کے لئے اپنی آرام طلبی و تن آسانی کا خون کریں، آپ کے بدن پر جو تنزیب اور ڈوریا ہے اسے اتار کر پھینک دیں۔"

انھوں نے تحریک خلافت میں ہندوؤں کی شرکت کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کرتے ہوئے ہندو مجمع سے کہا تھا:

"اگر تمہیں آریاورت اور بھارت ماتا سے محبت ہے تو آس پاس کے ملکوں اور ان پڑوسیوں کی سلطنتوں کی آزادی کو بچانے کی کوشش کرو جنہوں نے کسی طرح اب تک اپنی آزادی برقرار رکھی ہے، ورنہ یاد رکھو تمہارے پاؤں کی بیڑی اور بھی بوجھل ہو جائے گی۔"

مولانا محمد علیؒ نے غلامی کی زندگی کے مقابلے میں موت کو گلے لگانا سکھایا۔

اور اعلان کیا ؎

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی — ہوس زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی

جدوجہد آزادی میں وہ اپنی جان قربان کرنے کے لئے بے چین تھے ؎

نقد جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر — کام کرنے کا یہی ہے، تمہیں کرنا ہے یہی

کیا راہ آزادی میں اپنی جان کو قربان کر دینے کی یہ سب صدائیں بیکار گئیں!

ہندوستان کی تحریک آزادی میں ایک اہم منزل تحریک خلافت تھی۔

تحریک خلافت کو بعض لوگوں نے بہت محدود پس منظر میں دیکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی تحریک آزادی میں جو جان آئی وہ تحریک خلافت ہی کی راہ سے آئی۔ اس نے پوری قوم کو خواب گراں سے بیدار کر دیا۔ آزادی کے لیے جان دینے کا جذبہ پیدا کیا۔ ممکن نہیں تھا کہ یہ نعرہ کہ ؎

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پر دے دو

محض تصور خلافت تک محدود رہتا۔ اس نے عروق مردہ میں خون زندگی دوڑایا۔ اور اپنے مطالبات کے حصول کے لیے سر کو ہتھیلی پر رکھ کر میدان عمل میں کود پڑنے کا جذبہ پیدا کیا۔ مہاتما گاندھی کی دوربین نگاہوں نے اس تحریک سے پیدا ہوئے اثرات کو دیکھ لیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اس میں پورے عزم کے ساتھ شریک ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح مہاتما گاندھی نے تحریک خلافت کے ذریعہ تحریک آزادی میں نئی قوت پیدا کی۔ اپریل ۱۹۲۴ء کے YOUNG INDIA کے ایک بیان میں کہتے ہیں۔

"خلافت کی یہی تحریک ہے جس نے قوم کو بیداری عطا کی۔ اب میں اسے سونے نہ دوں گا۔"

بنگال نے تحریک خلافت میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ بھلائے نہیں جا سکتے۔ مسجد ناخدا کے بام و در اب تک ان خطبات کی آوازوں سے گونج رہے ہیں جو مولانا آزاد نے وہاں دیئے تھے۔ GAIL MINAULT نے بتایا ہے کہ بنگال کے دیہاتوں میں رضاکاروں کے لئے باقاعدہ لیکچر ہوتے تھے ان رضاکاروں نے عدالتوں اور بدیشی چیزوں کے بائیکاٹ میں بڑی مدد دی۔ (THE KHILAFAT MOVEMENT P.164) آگرہ میں خلافت کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا تھا۔

"لیکن جب تک برٹش گورنمنٹ فریق محارب ہے، وہ خلافت کے مطالبات پورے نہیں کرتی، جب تک ہندوستان کو سچے اور حقیقی معنوں میں سوراج نہیں دیتی، ... اس وقت تک مسلمانوں کے لئے اس کا وجود، اس کے گورنروں کا وجود، اس کی عدالتوں کا وجود، ظلم و ستم کی کارروائیاں ہیں ... مسلمان کے لئے ممکن ہے کہ بچھوؤں کو ہتھیلی پر رکھ کر دودھ پلائے لیکن یہ ممکن نہیں کہ انگریزوں کے ساتھ صلح کرے۔" (خطبات آزاد ص ۵۰)

یہ تھا خلافت کا وہ ایجی ٹیشن جس نے ہندوستان میں آزادی کی لگن پیدا کی، انقلابی جذبات کو ابھارا، اور سرفروشی کے میدان میں لا کھڑا کیا۔

بنگال نے ملک کی تحریک آزادی میں جو حصہ لیا ہے اس کا مکمل جائزہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک فرائضی تحریک، مجاہدین کی جدوجہد، حزب اللہ کے انقلابی عزائم، الہلال اور کامریڈ کی صدائے حریت اور خلافت کی ملک گیر سیاسی سرگرمی۔ ان سب تحریکوں کے اثر و نفوذ، مقصد و منہاج کا جائزہ نہ لیا جائے۔

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن — خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

اقبالؔ اور سرزمین اُندلُس

از

جناب محمد بدیع الزماں صاحب۔ ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پھلواری۔ پٹنہ

(۱)

اقبالؔ نے خلافتِ راشدہ سے لے کر خلافتِ عثمانیہ تک کی اسلامی مملکتوں کے عروج و زوال پر مختلف نظموں اور منفرد اشعار میں مختلف طریقوں سے اسلاف کے جذبۂ ایمانی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے درپردہ اپنے عہد کے مسلمانوں کے جذبہ ایمانی کو تازیانہ لگایا ہے۔ کچھ اس لئے بھی کہ اس صدی کے اوائل میں بلقان کی جنگوں اور پہلی جنگِ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) کے نتیجے کے طور پر مسلم حکومتیں مغربی سامراجیوں کے سامنے گھٹنے ٹیک کر رحم کی درخواست میں مشغول تھیں اور اقبالؔ کے الفاظ میں صورت حال کچھ اس طرح تھی۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ — خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی — ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

(بانگ درا: "خضر راہ: دنیائے اسلام")

حالیؔ تفصیل سے عظمت رفتہ کی یاد لوگوں کو دلا چکے تھے۔ اکبرؔ "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو" کی تلقین عام مسلمانوں، خصوصاً تعلیم یافتہ طبقہ کو کرتے رہے تھے۔ حالیؔ اور اکبرؔ کے ذریعہ ہموار کی گئی اس زمین پر ضرورت اقبالؔ جیسے مفکر اور مجتہد کی تھی جو مسلمانوں کے تن بے روح میں، جس سے بقول ان کے حق تک بیزار تھا، نئی جان ڈال سکے۔ اسی لئے اقبالؔ نے ساری زندگی مسلمانوں کو صرف یہی تلقین کی کہ: "لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر" اور ان خصوصی نظموں،

جن کا تجزیہ اس مضمون میں مقصود ہے، کے رقم کرنے کی توجیہہ بھی یہی تھی۔

اقبالؔ نے خلافتِ راشدہ سے لے کر اپنے عہد تک کی قائم کردہ مسلم مملکتوں میں صرف اندلس (موجودہ اسپین) اور صقلیہ (موجودہ سسلی جو یونان کا حصہ ہے) پر ہی خصوصی نظمیں لکھی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے دنیا کے کسی بھی خطّہ میں جہاں بھی اسلامی ریاستیں قائم کیں یا جہاں کہیں بھی وہ جا کر آباد ہوئے، خواہ وہ وہاں اقلیت ہی میں کیوں نہ ہوں، ان کی حکومتیں بھلے ختم ہو گئی ہوں اور سیاسی اقتدار غیر مسلموں کے ہاتھوں میں ہی آ گیا ہو مگر کہیں بھی سوا اسپین اور صقلیہ کے ان کا نام و نشان نہیں مٹا، ان کی تاریخی عمارتیں اور مسجدیں مسمار نہیں کی گئیں اور اگر مسمار نہیں کی گئیں تو انہیں کلیسا میں تبدیل نہیں کیا گیا اگر دنیا کے کسی خطّے سے اسلامی حکومتیں مٹ گئیں تو یہ کوئی المیہ نہیں اس لئے بقول اقبال ہی: "حکومت کا تو کیا رونا کہ یہ اک عارضی تھی"۔

مگر اسپین اور صقلیہ کا اسلامی تاریخ میں المیہ یہ ہے کہ اس اسپین (اندلس) میں جہاں مسلمانوں نے قریب ساڑھے سات سو سال (۱۴۹۲-۷۵۶ء) تک اور صقلیہ میں قریب دو سو سال (۸۷۸-۱۰۷۲) تک حکومت کی آج ان دونوں میں ایک بھی کلمہ گو نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے مسلم حکومتوں پر اگر خصوصی نظمیں لکھیں تو صرف ان دونوں پر اور اندلس پر تو ایک دو نہیں بلکہ پانچ نظمیں لکھ ڈالیں۔ جن میں تین: (۱) "دعا"، (۲) "مسجد قرطبہ"، (۳) "ہسپانیہ"، سرزمین ہسپانیہ (اسپین) ہی میں لکھی گئیں اور باقی دو: (۱) "طارق کی دعا (اندلس کے میدان جنگ میں)" اور (۲) "عبد الرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت سرزمین اندلس میں" اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ یہ پانچوں نظمیں ان کے مجموعہ کلام: "بال جبرئیل" میں شامل ہیں اور نظم "صقلیہ" "بانگ درا" کا حصہ ہے۔

موخر الذکر نظم اقبالؔ نے ۱۹۰۸ء میں لکھی تھی جب وہ یورپ میں تین سال تک تعلیم حاصل کر چکنے کے بعد بحری راستے ہندوستان واپس ہوتے ہوئے جزیرہ صقلیہ سے گزرے حالانکہ وہاں

انھوں نے قیام نہیں کیا۔ صقلیہ گو اس مضمون کا موضوع نہیں (اس لئے کہ یہ اسپین کا حصہ نہیں) مگر چونکہ اس کا بھی المیہ مسلم تاریخ میں اسپین ہی جیسا ہے اسی لئے اس نظم کے چند اشعار ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں تاکہ ہم اس المیہ پر اقبال کے وفورِ جذبات کا اندازہ لگا سکیں۔ جو ان جذبات کے بھی آئینہ دار ہیں جن کے تحت انہوں نے اسپین پر پانچ نظمیں لکھیں۔ نظم "صقلیہ" کے چند اشعار یہ ہیں:۔

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار — وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی — بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
اک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور — کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغِ ناصبور

غلغلوں سے جس کی لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے؟

غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا — چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا
رنگ تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے — قصّہ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں، اوروں کو وہاں رلواؤں گا

اقبال کی یہ خصوصی نظمیں درج ذیل قرآنی آیات کے ترجموں ہی کے پسِ منظر میں پڑھی جا سکتی ہیں کیوں کہ اقبال نے درپردہ انہیں آیات کو مسلمانوں کو ذہن نشیں کرانا چاہا ہے ورنہ ان گزرے ہوئے واقعات کو اتنی تفصیل سے رقم کرنے کی ضرورت انہیں نہ تھی:۔

"ہر قوم کے لئے مہلت کی ایک مدت مقرر ہے، پھر جب کسی قوم کی مدت آن پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی تاخیر و تقدیم بھی نہیں ہوتی۔ (اور یہ بات

اللہ نے آغازِ تخلیق ہی میں صاف فرما دی تھی کہ) اے بنی آدم! یاد رکھو، اگر تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات سنا رہے ہوں، تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنے رویّہ کی اصلاح کرے گا اس کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے، اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلہ میں سرکشی برتیں گے وہی اہلِ دوزخ ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" (سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۴) کوئی قوم نہ اپنے وقت سے پہلے ختم ہوئی اور نہ اس کے بعد ٹھیر سکی۔ پھر ہم نے پے در پے اپنے رسول بھیجے۔ جس قوم کے پاس اس کا رسول آیا، اس نے اسے جھٹلایا، اور ہم ایک کے بعد ایک قوم کو ہلاک کرتے چلے گئے، حتّٰی کہ ان کو بس افسانہ ہی بنا کر چھوڑا۔ پھٹکار ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے۔" (سورۃ المومنون ۲۳۔ رکوع ۳) "کتنی ہی خطاکار بستیاں ہیں جن کو ہم نے تباہ کیا ہے اور آج وہ اپنی چھتوں پر الٹی پڑی ہیں، کتنے ہی کنوئیں بیکار اور کتنے ہی قصر کھنڈر بنے ہوئے ہیں، کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے یا ان کے کان سننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔" (سورۃ الحج ۲۲۔ رکوع ۶) "کیا انہوں (حق کے جھٹلانے والوں) نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے اپنے زمانہ میں دور دورہ رہا ہے؟ ان کو ہم نے زمین میں وہ اقتدار بخشا تھا جو تمہیں نہیں بخشا ہے، ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں بہا دیں (مگر جب انہوں نے کفرانِ نعمت کیا تو) آخر کار ہم نے ان کے گناہوں کے پاداش میں انہیں

تباہ کر دیا اور ان کی جگہ دوسرے دور کی قوموں کو اٹھایا۔" (سورۃ الانعام ۶۔ رکوع ۱)

اقبال نے ان ہی آیات کی ترجمانی "بانگ درا" کی نظم "گورستانِ شاہی" کے درج ذیل اشعار میں کی ہے:۔

زندگی اقوام کی بھی ہے یوں ہی بے اعتبار — رنگ ہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار
اس زیاں خانے میں کوئی ملت گردوں وقار — رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار

ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نامِ نو
مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو

(۲)

اندلس (اسپین) کی سرزمین سے اقبال کی خصوصی دلچسپی کی وجہ یہ بھی ہے کہ نومبر ۱۹۳۲ء میں ہندوستان کو آئینی اور دستوری مراعات دیے جانے کے لئے حکومتِ برطانیہ کی طرف سے لندن میں بلائی گئی تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد واپسی میں وہ ہسپانیہ سے ہوتے ہوئے اٹلی گئے جہاں مسولینی نے خصوصی طور پر ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اقبال نے ہسپانیہ کے اسی قیام میں تین نظمیں لکھیں۔ (۱) ہسپانیہ (۲) مسجد قرطبہ (۳) دعا۔

اندلس (موجودہ اسپین) کا رقبہ پانچ ہزار مربع کیلو میٹر اور موجودہ آبادی قریب چار کروڑ ہے۔ وہاں مسلمانوں نے ۷۵۶ء (مطابق ۱۳۸ھ) سے ۱۴۹۲ء (مطابق ۸۹۷ھ) تک حکومت کی۔ قبل اس کے کہ اقبال کی ان پانچ نظموں کا تجزیہ کیا جائے یہ ضروری ہے کہ اسپین پر مسلم حکومت کے قیام کی مختصر تاریخ سامنے رکھی جائے تاکہ اسی پس منظر میں ہم ان واقعات کو جن کا ذکر ان نظموں میں کیا گیا ہے۔ پورے طور پر گرفت میں لاسکیں۔

اسپین کی پہلی خود مختار اور آزاد اسلامی حکومت کے بانی عبدالرحمٰن اول بن معاویہ ہیں'

جنہوں نے ۱۳۸ھ مطابق ۷۵۶ء میں اسپین پہنچ کر برسرِ اقتدار سرداروں کو زیر کرکے اسپین میں خاندان بنی امیہ کی نئے سرے سے آزاد خود مختار حکومت قائم کی تھی مگر اسپین پر مسلمانوں نے سب سے پہلا حملہ ۹۲ھ مطابق ۷۱۱ء میں ولید بن عبدالملک کے عہد حکومت میں کیا تھا اسی سال افریقہ کے گورنر موسیٰ بن نصیر نے سلطان ولید بن عبدالملک سے اجازت لے کر اپنے آزاد کردہ غلام طارق بن زیاد حاکم طنجہ کو اسپین و پرتگال کی فتح کے لئے ایک مختصر سے بحری لشکر کے ساتھ روانہ کیا تھا۔ اس لشکر میں زیادہ تر بربری نومسلم تھے۔ طارق نے اسپین کے ساحل پر اترنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جن جہازوں میں اسلامی لشکر آیا تھا ان کو سمندر میں غرق کر دیا تاکہ کوئی سپاہی میدانِ جنگ سے بھاگنے یا واپس جانے کا تصور ہی نہ کر سکے۔ یعنی یا تو وہ اس ملک کو فتح کریں گے یا اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ طارق نے ایک چھوٹی سی بارہ ہزار کی اسلامی فوج کے ساتھ شاہ اسپین رزریق کے ایک لاکھ کے لشکر عظیم سے جنگ کی اور ایسی شکست دی کہ پھر عیسائی اسپین میں کہیں بھی مسلمانوں کے سامنے جم کر نہ لڑ سکے۔ طارق نے قرطبہ اور اسپین کے بہت سے صوبے فتح کئے جس میں پایہ تخت طلیطلہ بھی شامل ہے۔ اس کے فوراً ہی بعد گورنر موسیٰ بن نصیر بھی بڑے لشکر کے ساتھ اسپین پہنچ گئے اور دونوں نے مل کر سارے اسپین اور پرتگال پر ۹۴ھ میں قبضہ کر لیا۔ صرف اسپین کا شمالی پہاڑی علاقہ عیسائیوں کے پاس رہ گیا آج جبرالٹر جس کا مسلم دورِ حکومت میں جبل الطارق نام تھا طارق کے ان ہی فتوحات کی یاد دلاتا ہے۔ یہ دونوں اس کے بعد فرانس تک میں داخل ہو گئے اور جنوبی فرانس پر بھی قبضہ کر لیا۔

اسپین میں مسلم حکومت قائم ہو چکنے کے بعد مسلمانوں میں کافی خانہ جنگی ہوتی رہی۔ اسپین کی بدنظمی یہاں تک بڑھ گئی کہ اسپین کا جو مسلم سردار بھی دوسرے سردار پر غالب آجاتا تھا وہ طاقت کے بل پر خود ہی اسپین کا گورنر بن بیٹھتا تھا۔ چنانچہ اسپین کا سب سے آخری گورنر

(عبدالرحمٰن اول کے سلطنت قائم کرنے کے قبل) یوسف بن عبدالرحمٰن تھا جس نے تمام سرداروں کو شکست دے کر وہاں کی حکومت پر قبضہ جما لیا تھا اور خود ہی گورنر بن بیٹھا تھا۔ اسپین کی آزاد اور خود مختار اسلامی حکومت کے بانی عبدالرحمٰن اول بن معاویہ نے اسپین پہنچ کر اسی آخری گورنر سے حکومت چھینی تھی۔

عباسیوں کے لیے، جنہوں نے ۱۳۲ھ مطابق ۷۵۰ء میں دمشق کا تختہ الٹ کر بنی امیہ سے خلافت چھینی تھی، یہ چیز بہت تکلیف دہ تھی کہ اسی بنو امیہ کے خاندان کے ایک شہزادہ عبدالرحمٰن اول نے اسپین میں نئے سرے سے بنی امیہ کی حکومت قائم کر لی تھی چنانچہ عباسی خلیفہ منصور عباسی کے حکم سے ۱۴۶ھ میں عباسیوں نے اچانک اسپین پر حملہ کر دیا جو اتنا شدید تھا کہ اسپین کا بیشتر علاقہ عبدالرحمٰن اول کے ہاتھ سے نکل گیا مگر دو ماہ بعد پھر انہوں نے عباسیوں کو شکست دے کر پورے اسپین پر قبضہ کر لیا۔ عباسیوں نے شکست کے بعد عبدالرحمٰن اول کے خلاف اندرونی بغاوت کو کافی ہوا دی اور نتیجتاً جنوبی فرانس مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

عبدالرحمٰن اول کے بعد اسپین میں مسلم حکومت دن رات باہمی خانہ جنگی، بغاوت اور شورشوں کا شکار رہی اور خود مسلمان سرداروں نے قتل کا بازار گرم کر رکھا تھا چنانچہ خاندان بنی امیہ کے آخری برائے نام بادشاہ سلطان ہشام بن محمدی اموی کی موت کے بعد اسپین کی مرکزی حکومت ختم ہو گئی مگر اسلامی حکومت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئی۔ یہ ریاستیں بھی دن رات خانہ جنگی میں مبتلا رہیں اور نتیجتاً اسپین کے عیسائی سلاطین نے اس سے فائدہ اٹھا کر بہت سے علاقوں کو اپنی حکومتوں میں شامل کر لیا۔

ایک دن وہ آیا کہ تین چوتھائی اسپین پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا اور صرف ایک چوتھائی جنوبی اسپین پر مسلمانوں کی حکومت باقی رہ گئی جو تاریخ میں "سلطنت غرناطہ" کے نام سے مشہور

ہے جس کا بانی نصر بن یوسف تھا جو تاریخ میں "ابن الاحمر" کے نام سے مشہور ہے۔ اس سلطنت میں بھی خانہ جنگی جاری رہی اور زیادہ سلاطین غدار تھے جنہوں نے عیسائیوں سے ساز باز کر رکھا تھا اس سلطنت کا آخری بادشاہ ابو عبداللہ تھا جس نے ۸۹۷ھ مطابق ۱۴۹۲ء میں غرناطہ شاہ فرڈیننڈ کے حوالہ کر کے قلعہ کی کنجیاں اسے دے کر غرناطہ چھوڑ دیا۔

اسپین کے مسلمانوں کا جو انجام عیسائیوں کے ہاتھوں ہوا اس کی داستان بڑی دردناک ہے۔ مسلمانوں کو حکم دے دیا گیا کہ یا تو دین مسیحی قبول کر دیا مرنے کو تیار ہو جاؤ۔ ہزاروں مسلمان روزانہ جلتی ہوئی آگ میں ڈال کر زندہ جلا دئے جاتے تھے یا انہیں تہہ تیغ کر دیا جاتا تھا یا سمندر میں ڈبو دیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ مدت دراز تک جاری رہا یہاں تک کہ چند سال بعد ایک بھی کلمہ گو نہ بچا۔ مساجد یا تو مسمار کر دی گئیں یا گرجا میں تبدیل کر دی گئیں اور لاکھوں نایاب اسلامی کتابیں سمندر کی تہہ میں پہنچا دی گئیں۔

(۳)

اس مختصر سی تاریخ سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ طارق بن زیاد کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد عیسائیوں نے سات سو سال کبھی بھی جنگ کر کے دوبارہ اسپین پر اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہاں سے اسلامی حکومت کا خاتمہ خود مسلمانوں کے ہاتھ ہوا جو سات سو سال تک باہمی خانہ جنگی اور قتل و غارت گری میں لگے رہے۔ اب اس پس منظر میں اقبال کی ان پانچ نظموں کو اگر پڑھا جائے تو یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال بلاواسطہ تفصیلی طور پر صرف اسپین پر پانچ نظمیں لکھ کر خدا کے ان ارشادات کی یاد دلانا چاہتے ہیں کہ:

"اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو۔" (سورۃ الاعراف رکوع ۱۲) "لوگو! تم سے پہلے کی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا جب انہوں نے ظلم کی

روش اختیار کی اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور
انہوں نے ایمان لاکر ہی نہ دیا۔ اس طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے
ہیں۔ اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی ہے، تاکہ دیکھیں تم کیسے
عمل کرتے ہو (سورۃ یونس ۱۰۔ رکوع ۲) "اگر تم ایمان رکھو اور تقویٰ کی روش
پر چلتے رہو تو اللہ تمہارے اجر تم کو دے گا اور وہ تمہارے مال تم سے نہ مانگے گا۔۔۔
اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے"
(سورۃ محمدؐ ۴۷۔ رکوع ۴)

اسپین میں مسلم حکومت کے قیام پر اقبال کی پہلی نظم "طارق کی دعا" (اندلس کے میدان جنگ
میں) ہے۔ یہ نظم اقبال کی قوت متخیلہ کی دلیل ہے۔ کیوں کہ راڈرک شاہ اسپین کی فوجوں سے
معرکہ آزما ہونے سے پہلے طارق نے میدانِ جنگ میں خدا سے جو بھی دعا کی ہو وہ تو بجنسہٖ
اقبال تک نہیں پہنچی لیکن اقبال نے "صاحبِ اوصافِ حجازی" کے ایمانی جذبہ کو ملحوظ رکھ کر یہ
اندازہ لگایا کہ طارق کی دعا اسی نوعیت کی رہی ہوگی۔ طارق کی زبان پر اقبال نے جو دعائیں رکھی ہیں انکے چند اشعار
ہیں۔

یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے — جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن — نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی
کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو — ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے — وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

نعرۂ لاتذر کی تلمیح سے اقبال کا اشارہ درج ذیل آیت کی طرف ہے:
"اور نوحؑ نے کہا، "میرے رب، ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا
نہ چھوڑ (وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا) اگر تو نے
ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا
ہوگا بدکار اور سخت کافر ہی ہوگا۔" (سورہ نوح ۷۱۔ رکوع ۲)

اس آیت کی طرف اشارہ کرنے سے اقبال کا مطلب یہ ہے کہ مومن کی سب سے
بڑی آرزو یہی ہوتی ہے کہ دنیا سے کفر کا خاتمہ ہو جائے اور اسلام سارے ادیان پر غالب آجائے
چنانچہ وہ اسی مقصد کے لئے جہاد فی سبیل اللہ کرتا ہے۔

اقبال نے طارق کے ہمراہیوں کو "پراسرار بندے" اس لئے کہا ہے کہ جب شاہ اسپین
راڈرک کے سپہ سالار کو طارق نے شکست دے دی تو وہ اس شکست سے اس قدر خوفزدہ
ہوا کہ اس نے راڈرک کو ان الفاظ میں اس واقعہ کی اطلاع دی:۔
"ہمارے ملک پر ایسے آدمیوں نے حملہ کیا ہے کہ نہ ان کا وطن معلوم ہے نہ اصلیت
کہ وہ کہاں سے آئے ہیں۔ زمین سے نکلے ہیں یا آسمان سے اتر پڑے ہیں۔"

اطلاع کے اس آخری فقرہ سے اقبال نے "پراسرار بندوں" کی ترکیب اخذ کی ہے۔ جہاں
تک "ذوقِ خدائی" بخشے جانے والے بندوں کو ٹھوکروں سے دریا کے دو نیم ہونے کی بات ہے
اس کی مثال قرآن میں قصۂ فرعون وکلیم کے سلسلہ میں مذکور ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو
مصر سے لے کر راتوں رات نکلے تو فرعون کے لشکروں نے آپ کا تعاقب کیا۔ جب دونوں گروہوں
کا آمنا سامنا ہوا تو قرآن میں مذکور ہے کہ:۔
"موسیٰؑ کے ساتھی چیخ اٹھے کہ: "ہم تو پکڑے گئے" موسیٰؑ نے کہا: "ہرگز نہیں۔

میرے ساتھ میرا رب ہے۔ وہ ضرور ہماری رہنمائی فرمائے گا۔" ہم (خدا) نے موسیٰؑ
کو وحی کے ذریعہ سے حکم دیا کہ: "مار اپنا عصا سمندر پر۔" یکایک سمندر پھٹ
گیا اور اس کا ہر ٹکڑہ ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا۔ اسی جگہ ہم دوسرے
گروہ کو بھی قریب لے آئے۔ موسیٰؑ اور ان سب لوگوں کو جو اس کے ساتھ تھے، ہم
نے بچا لیا، اور دوسروں کو غرق کر دیا۔" (سورۃ الشعراء ۲۶۔ رکوع ۴)

اس نظم کے آخری دو اشعار میں جو دعا مانگی گئی ہے وہ اپنے اندر شان عمومیت رکھتی ہے۔
یعنی ہر زمانہ میں مسلمان اللہ سے یہ دعا کر سکتے ہیں جو طارق نے ۹۲ھ میں مانگی تھی۔

(۴)

اسپین میں مسلم دورِ حکومت پر اقبال کی دوسری نظم: "عبدالرحمٰن اوّل کا بویا ہوا کھجور کا پہلا
درخت سرزمین اندلس میں" ہے۔ اس عنوان کے تحت اقبال نے یہ ذیلی نوٹ دیا ہے کہ:۔

"یہ اشعار جو عبدالرحمٰن اوّل کی تصنیف سے ہیں تاریخ المقری میں درج ہیں۔
مندرجہ ذیل اردو نظم ان کا آزاد ترجمہ ہے (درخت مذکور مدینۃ الزہرا میں بویا گیا تھا)۔"

عبدالرحمٰن اوّل جو اندلس کی پہلی آزاد اور خود مختار اسلامی حکومت کا فرماں رواں تھا، میوہ دار
درختوں کا بڑا شائق تھا۔ اس لئے اس نے اپنے قصر کے پائیں باغ میں کھجور کا درخت بھی بویا تھا
جس کی گٹھلی ملک شام کے درخت کی تھی۔ ایک دن شام کے وقت وہ جب باغ میں آیا تو وہ اس
وقت اپنے رشتہ داروں اور ہمراہیوں کی غداری اور بے وفائی سے حد درجہ ملول تھا۔ اسی حال
میں اس کی نظر کھجور کے اس دل پسند درخت پر پڑی جسے دیکھ کر اس کے دل میں اپنے وطن کی
یاد تازہ ہو گئی اور اس کا دل بھر آیا اور بے اختیار اس کی زبان پر یہ اشعار جاری ہو گئے جن کا اقبال
نے اس نظم میں آزاد ترجمہ کیا ہے اور بعض خیالات کا اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے:۔

تبدت لنا وسط الرصافة نخلة　　تناءت بارض الغرب عن بلدة النخل
فقلت شبیھی بالتغرب والنوی　　وطول التنائی من بنی و من اھلی
نشأت بارض انت فیھا غریبة　　فمثلک فی الاقصاء والمنتای مثلی
سقتک غوادی المزن فی المنتای الذی
یسح و یستقی المساکین بالربل

اس نظم کے آزاد ترجمہ میں اقبال نے سب سے آخر میں ایک حقیقی مومن کے طرز فکر اور
طرز عمل کو اس طرح رقم کیا ہے ؎

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے　　مومن کا مقام ہر کہیں ہے

یہ تھیں طارق اور عبدالرحمٰن اوّل کی دو عظیم ہستیاں جنہوں نے اسپین میں کلمۂ حق
بلند کیا اور جن پر درج ذیل قرآنی آیات کا اطلاق ہوتا ہے:۔

"اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت
سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے
وہ دل شکستہ نہیں ہوئے۔ انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی، وہ (باطل کے آگے)
سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔" (سورۃ آل عمران ۳۔ آیت ۱۴۶)

(۵)

اب وہ تین نظمیں ہیں جو سرزمین اندلس میں لکھی گئیں جن میں ایک "ہسپانیہ" ہے۔ اس نظم
میں اقبال نے ان عرب صحرا نشینوں کے جذبۂ ایمانی کی یاد دلائی ہے جنہوں نے حق کا
علم بلند کرنے کے لئے اس سرزمین کو اپنے خون سے سینچا جس کی بدولت یہ سرزمین اقبال
کی نظروں میں حرم کی روح مقدس ہو گئی۔ اور جس زمین کی خاک میں اقبال کے دل کی نگاہوں

کو سجدوں کے نشانات نظر آئے اور اس کی ہواؤں سے کانوں میں خاموش اذانیں سنائی دیں۔
اس سرزمین میں پہنچنے پر اقبال کے دفورِ جذبات کا اندازہ اس نظم کے چند درج ذیل ابتدائی اشعار سے لگایا جا سکتا ہے :۔

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے | مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں

پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں | خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں

روشن تھیں ستاروں کی طرح ان کی سنانیں
خیمے تھے کبھی جن کے ترے کوہ و کمر میں

اتنا کہہ چکنے پر اقبال اپنے عہد کے مسلمانوں کے جذبۂ ایمانی کو استفہامیہ انداز میں اس طرح تازیانے لگاتے ہیں: "پھر تیرے حسینوں کی ضرورت ہے حنا کی؟"۔ اور ساتھ ساتھ دوسری ہی مصرعہ میں عام مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ: "باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں!"۔ جس سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ ہسپانیہ کے مسلمانوں کے مٹ جانے کا یہ مطلب نہیں کہ سارے مسلمانوں کا جذبۂ ایمانی ختم ہو چکا ہے بلکہ ابھی بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو حق کا علم بلند کرنے کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر سکتے ہیں۔ اور اس کی وجہ بھی اگلے شعر میں یہ بتاتے ہیں کہ ؎

کیوں کر خس و خاشاک سے دب جائے مسلماں | مانا وہ تب و تاب نہیں اس کے شرر میں

اقبال کے لئے نومیدی "زوالِ علم و عرفاں" تھی اور وہ لَاغَالِبَ اِلَّا ھُوْ پر یقین رکھتے تھے اور خدا کے ان ارشادات پر بھی یقین رکھتے تھے جن کی ترجمانی انہوں نے اس شعر میں کی ہے کہ :۔

"اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر (یعنی اہلِ ایمان کا لشکر) ہی غالب ہو کر رہے گا۔" (سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷۔ رکوع ۵ع) "اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب ہو کر رہیں گے۔

فی الواقع اللہ زبردست اور زور آور ہے۔" (سورۃ المجادلۃ ۵۸۔ آیت ۲۱)

"دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔" (سورۃ آل عمران ۳۔ آیت ۱۳۹)

اس نظم کے آخری دو اشعار میں اقبال نے دولتِ غرناطہ (موجودہ گرانڈا) کے زوال پر اپنے دردِ دل کا اظہار کیا ہے جو ہسپانیہ میں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی آخری نشانی تھی اور جس کے سقوط کے بعد مسلمان اس ملک سے ہمیشہ کے لئے مٹ گئے۔ ان اشعار میں اقبال نے اس کے آخری فرمانروا ابو عبداللہ کی بزدلی، بے دینی، بے غیرتی اور پست ہمتی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ابو عبداللہ نے قسطلہ کے عیسائی شاہ فرڈیننڈ سے یکم ربیع الاول ۸۹۷ھ مطابق ۱۴۹۲ء کو ایک خفیہ معاہدہ کر کے ساری سلطنت اس کے حوالہ کر دی اور وہ قلعہ کی کنجیاں اسے دے کر البشراۃ کی طرف روانہ ہو گیا جب وہ بیس میل چل کر ایک گاؤں میں رکا تو اپنے قصر کی یاد میں بچوں کی طرح رونے لگا۔ یہ حالت دیکھ کر اس کی غیرت مند ماں نے اس سے کہا:۔

"جب تو مردوں کی طرح اس محل کی حفاظت نہ کر سکا تو اب عورتوں کی طرح رونے سے کیا حاصل؟"

فرڈیننڈ نے ابو عبداللہ کو البشرہ میں بھی رہنے نہیں دیا۔ اور جب وہ وہاں سے نکالا گیا تو وہ افریقہ جا کر شاہِ مراقش کا ملازم ہو گیا اور وہیں فوت ہو گیا۔ اس نظم "ہسپانیہ" کے درج ذیل آخری دو اشعار ان ہی واقعات کے پس منظر میں ذہن نشین کئے جا سکتے ہیں:۔

غرناطہ بھی دیکھا مری آنکھوں نے ولیکن | تسکینِ مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں

دیکھا بھی دکھایا بھی، سنایا بھی سنا بھی | ہے دل کی تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں

دولتِ غرناطہ کے زوال اور بربادی پر ابن بدروں نے مرثیہ لکھا تھا جس کا ذکر اقبال نے "بانگِ درا" کی نظم "صقلیہ" کے اس شعر میں کیا ہے ؎

آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی — ابن بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

(۶)

سرزمین اندلس میں لکھی گئی سب سے معرکۃ الآرا نظم "مسجد قرطبہ" ہے۔ قرطبہ (موجودہ کورڈووا) اندلس کا مشہور شہر ہے جسے ۷۵۶ء میں فتح اندلس کے بعد عربوں نے اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اس کی اس جامع مسجد کی وسعت اور شان و شوکت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا طول و عرض ۴۲۴.۲۴ × ۳۴۶.۸ فٹ ہے۔ اس مسجد کو سلطان عبدالرحمٰن اول نے جامع دمشق کے نمونہ پر تعمیر کرایا تھا۔ ۱۲۳۶ء میں زوالِ قرطبہ کے بعد یہ عدیم المثال مسجد گرجا بن گئی یعنی فاتحین نے اس کی محراب کے سایہ میں ایک چھوٹا سا گرجا تعمیر کرلیا اور اس وقت سے یہ مسجد محروم اذاں ہے۔

شہر قرطبہ وادی الکبیر کے کنارے واقع ہے۔ چنانچہ اس نظم میں اقبال نے اسی مناسبت سے یہ شعر بھی کہا ہے کیوں کہ یہ مسجد اس کے قریب ہی واقع ہے ؎

آبِ رواں کبیر! تیرے کنارے کوئی — دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

ایک روایت ہے کہ اقبال نے حکومتِ ہند کے ذریعہ مسجد قرطبہ میں نماز پڑھنے کی اجازت مانگی جسے حکومت اسپین نے رد کر دیا۔ دوسری روایت ہے کہ جب اقبال اس مسجد میں پہنچے تو انہوں نے اذان دے دی اور نماز پڑھی جب تک حکومت کے کارندے ابھی یہ مشورہ کر رہے تھے کہ انہیں اذان دینے اور نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے یا نہیں۔

اس نظم میں اقبال نے اس مسجد کے جلال و جمال کی تعریف کی ہے مگر وہ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ چونکہ اس کے معمار "مردِ خدا" تھے عشقِ رسول میں دیوانے تھے، "مردانِ حق" تھے "حاملِ خلقِ عظیم" تھے "صاحبِ صدق و یقیں" تھے، "اہلِ دل" تھے "اس لئے لازم ہے کہ جو چیز بھی انہوں نے بنائی وہ اپنے جلال و جمال میں یکتا ہی ہوگی کیونکہ جو مومن اتنے اوصاف سے متصف ہو

اس کی کار آفرینی، کارکشائی اور کارسازی میں اس کے ذاتی کردار کا ہی پرتو نظر آئے گا۔ اس مسجد میں اقبال جو حسن دیکھتے ہیں اسے وہ قلبِ مسلماں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر — قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں

اس نظم کا کمال یہ ہے کہ اقبال نے وقت، فن اور عشق اور ان کے تحت نظریہ و تاریخ اور انقلابِ حال کی ایسی تصویر کشی کی ہے جس میں شاعر کے خونِ جگر میں ڈوبے ہوئے قلم نے فکر کو جذبہ میں اور جذبہ کو متحرک تصویروں میں منتقل کر دیا ہے۔ اس نظم میں جذبات سے فکر کو مہمیز ہوتی ہے اور فکر و تخیل کی مدد سے قاری حقیقت کی گرفت کی کوشش کرتا ہے گویا ایک معکوس ایجادی عمل سے وہ بھی گزرتا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب "نقوشِ اقبال" میں اس نظم پر ایک جامع تبصرہ ان الفاظ میں رقم کیا ہے جو اس نظم کی ظاہری اور باطنی خوبیوں اور اس کی بے اندازہ جاذبیت اور دلکشی پر محیط ہے۔ لکھتے ہیں:-

"اقبال نے اس تاریخی اور تاریخ ساز مسجد کی ساخت میں بیکراں جذبات، پاکیزہ محبت کے احساسات، فنِ تعمیر کی عبقریت، اسلامی آرٹ کا اعجاز، اور اس کی کرامت کی سادگی و پرکاری، جمال کی رعنائی اور حسن کی یکتائی کا بڑی بصیرت سے معائنہ کیا۔ اس منظرِ عبرت اثر نے مومن شاعر کے نازک جذبات کے تار چھیڑ دئے جس کے نتیجے میں وہ لافانی نغمہ دنیا نے سنا جسے ہم "مسجد قرطبہ" والی نظم میں گونجتا ہوا پاتے ہیں۔ اقبال کی نظر میں یہ وقیع مسجد اپنی مجموعی تصویر و تاثیر میں مومن کی تعمیر اور اس کی معنوی خوبیوں کی مادی تفسیر ہے ... اس نظم میں اقبال نے اپنے مردِ مومن اور انسانِ کامل کا پورا تعارف کرایا۔ اس کے ایمان و خلوص، روحانیت و محبت و جمال کی تصویر کشی کی اور اپنے فلسفۂ خودی کے بنیادی نکات کو ایمانی صفات کا رنگ

دے دیا اور پھر تاریخ کے مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے مستقبل تک پہنچ گئے ... ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسجد قرطبہ کے آئینے میں ہم اقبال کی ہشت پہلو شخصیت کے خط و خال دیکھ سکتے ہیں اور ان سے مل سکتے ہیں۔" (از مضمون: "مسجد قرطبہ")

اس نظم میں بھی اقبال کو ان حسینوں کی تلاش ہے جو اس بے اذان مسجد میں پھر کلمۂ حق بلند کر سکیں جن حسینوں کو انہوں نے "عشق بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں" کا لقب دیا ہے۔ اس مسجد کی عرصہ سات سو سال سے حرماں نصیبی پر وہ صرف آنسو نہیں بہاتے بلکہ اپنے عہد کے مسلمانوں کے جذبۂ ایمانی کو بھی تازیانے لگا کر عشق رسولؐ میں وہی گرویدگی پیدا کرانا چاہتے ہیں جو اس مسجد کے معماروں کا طرۂ امتیاز تھا۔ مسجد سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:۔

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں و آسماں — آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے — عشق بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں!

اس نظم میں سب کچھ کہہ چکنے پر آخری تین اشعار میں یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ:۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی — روح امم کی حیات کشمکش انقلاب
صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم — کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

"بانگ درا" کی نظم "بلاد اسلامیہ" کے تیسرے بند میں اقبال سرزمین قرطبہ کو اس تہذیب کا مدفن قرار دیتے ہوئے جس کی بدولت یورپ کے علمی باغوں کی بیلیں سرسبز ہو رہی ہیں یعنی یورپ میں علوم و فنون کا چرچا ہے، کہتے ہیں:۔

ہے زمین قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور — ظلمت مغرب میں جو روشن تھی مثل شمع طور

بجھ کے بزم ملت بیضا پریشاں کر گئی — اور دیا تہذیب حاضر کا فروزاں کر گئی

قبر اس تہذیب کی یہ سرزمین پاک ہے
جس سے تاک گلشن یورپ کی رگ نمناک ہے

(۷)

سرزمین اندلس میں لکھی گئی آخری اور تیسری نظم "دعا" ہے جس کی فضیلت یہ ہے کہ یہ مسجد قرطبہ میں بیٹھ کر لکھی گئی۔ اس میں اقبال نے دعا کی اہمیت، ماہیت اور افادیت پر شروع کے اشعار میں قرآنی تصورات کو پیش کیا ہے۔ اور آخر میں اسپین سے مسلمانوں کی تباہی پر ندامت کے ساتھ عالم مسلمانوں کی طرف سے اپنی کوتاہی عمل کا اعتراف کرتے ہوئے پھر وہی شراب کہن عطا کئے جانے کی مانگ کی ہے جو "صاحب اوصاف حجازی" کو عطا کئے گئے تھے۔ اس دعا میں وہ اپنی قوم کے تمام افراد کو بھی شریک کرتے ہیں جن کے لئے دنیوی مشغولیت ہی سب کچھ ہے یا جو عزلت گزیں ہیں مگر پھر بھی سب خدا کی نگاہ کرم ہی کے منتظر ہیں۔ کہتے ہیں:۔

پھر وہ شراب کہن مجھ کو عطا کر کہ میں — ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کر جام و سبو
چشم کرم ساقیا دیر سے ہیں منتظر — جلوتیوں کے سبو خلوتیوں کے کدو!

اقبال کے کلام میں دعاؤں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے کیوں کہ دعائیں مغز عبادت ہے۔ انہوں نے دوسرے موقعوں پر بھی خدا سے اسی "شراب کہن" عطا کئے جانے کے لیے دست سوال پھیلایا ہے۔ چنانچہ "بال جبریل" کی مثنوی "ساقی نامہ" میں بھی ملتی ہیں کہ ؎

شراب کہن پھر پلا ساقیا — وہی جام گردش میں لا ساقیا

اقبال کے نزدیک یہ "شراب کہن" ہے عشق رسولؐ میں گرویدگی۔ جو "عشق بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں" پیدا کرتی ہے۔ یہ "شراب کہن" کیسی سرمستی پیدا کرتی ہے اسے اقبال نے متذکرہ بالا شعر کے بعد ہی اس شعر میں تشریح کر دی ہے ؎

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا — مری خاک جگنو بنا کر اڑا!

ملاجیون امیٹھوی اور ان کی تفسیر احمدی

از

محمد عارف اعظمی عمری رفیق دار المصنفین

(۲)

۴۔ خلاصہ وانتخاب شاطبی: علم تجوید و قرأت میں شاطبی کے منتخبات کا یہ مجموعہ انھوں نے امیٹھی میں درس و تدریس کے دوران مرتب کیا۔ غالب قرینہ یہ ہے کہ یہ رسالہ عربی ہی میں رہا ہوگا۔ اب نایاب ہے۔

۵۔ مثنوی فارسی: یہ مثنوی ملاجیون کے بیان کے مطابق چھ دفتروں پر مشتمل تھی جس میں پچیس ہزار اشعار تھے۔ اور یہ پوری مثنوی مولانا روم کی مثنوی کے طرز پر تھی۔

۶۔ دیوان فارسی: فارسی زبان میں دیوان حافظ کے نہج پر پانچ ہزار اشعار کا ایک مجموعہ تھا۔

۷۔ قصیدۂ نعت: عربی زبان میں قصیدہ بردہ کے طرز پر دوسوسات اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ تھا جو انہوں نے سفر حج کے دوران کہا اور اس کی عربی شرح بھی لکھی۔

۸۔ دیگر قصائد: انتیس فصیح و بلیغ عربی قصائد جن کی تحسین حرمین کے لوگوں نے کی۔

۹۔ نور الانوار شرح المنار: یہ شیخ ابو البرکات نسفی کی کتاب منار الانوار کی شرح ہے جو حنفی اصول فقہ کی مختصر مگر جامع کتاب ہے۔ ملاجیون نے اس شرح کو ۱۱۰۵ھ میں مدینہ منورہ کے قیام کے دوران میں صرف دو ماہ کے عرصہ میں روضۂ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھ کر تصنیف کیا تھا۔ یہ کتاب آج بھی مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ اس کی زبان نہایت دلکش اور سہل ہے اور طریقۂ استنباط و استدلال اس درجہ دل نشیں ہے کہ آج بھی یہ کتاب متداول اور نصاب میں داخل ہے۔

۱۰۔ سوانح: یہ رسالہ جامی کی لوائح کے طرز پر ہے۔ جب دوبارہ انہوں نے حجاز کا سفر کیا تو اسی زمانہ میں اس کو لکھا۔

۱۱۔ مناقب الاولیاء: غالباً یہ ملاجیون کی آخری تصنیف ہے جس میں انہوں نے اپنے خاندانی بزرگوں کے حالات لکھے ہیں اور خود اپنی ستر سالہ سوانح عمری بھی درج کی ہے۔ جس کا تکملہ ان کے فرزند ملا عبد القادر نے ان کی وفات کے بعد لکھا۔ یہ کتاب فارسی میں ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ دار المصنفین میں موجود ہے جو ۱۷ر جولائی ۱۸۹۸ء میں عاشق علی کے ہاتھوں قلمبند کیا گیا ہے۔

تفسیر احمدی کی خصوصیات یہ مکمل قرآن مجید کی تفسیر نہیں ہے۔ بلکہ اس میں احکام و مسائل سے متعلق آیتوں کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔ اس ضمن میں ملا صاحب نے قرآن مجید کی اکسٹھ سورتوں کی اہم احکامی آیتوں سے تعرض کیا ہے۔ ان احکام کی تعداد دو سو چھتر ۲۷۶ ہے، بقیہ سورتوں کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ احکام سے خالی ہیں۔ اس کی مکمل فہرست انہوں نے مقدمہ میں درج کر دی ہے۔

اس تفسیر کی ترتیب قرآن مجید کی سورتوں کے مطابق ہے۔ آیات کی تشریح میں ان کے نزول کا پس منظر بھی بیان کیا ہے اور الفاظ کی لغوی تحقیق بھی کی گئی ہے، اور فقہی مباحث میں فقہ اور علم کلام کی اہم تصانیف کی روشنی میں جا بجا منطقیانہ استدلال بھی کیا گیا ہے۔ اور حنفی نقطۂ نظر کو پیش کیا گیا ہے، زبان و بیان دلکش و دلآویز ہے جس میں سجع و قوافی کی مکمل رعایت کے باوجود ادائے مطلب میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا ہے۔

بظاہر اس تفسیر کا اصل مأخذ امام رازی کی تفسیر کبیر ہے، لیکن ترتیب و تبویب امام ابوبکر بن عربی اندلسی اور امام ابو بکر الجصاص حنفی کی احکام القرآن کے انداز پر کی ہے گو مصنف نے خود کہیں اس کی کوئی صراحت نہیں کی ہے۔ بلکہ انہوں نے امام غزالی کی ایک تصنیف کو اس کا محرک

بتایا ہے جو خود انہیں بھی دستیاب نہیں ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں:

وقد کنت قدیما اسمع من افواہ
الرجال الکرام ان الامام الغزالی
الذی ھو من اجلۃ علماء الاسلامؒ
قد جمع آیات الاحکام بحسب
الطاقۃ والامکان حتی بلغت
خمسمأۃ بلا زیادۃ ولا نقصان
وکنت علی ذلک برھۃ من الزمان
وحدۃ من الاکوان حتی وقفت
علی کتب الاصول للعلماء الفحول
ذکروا فیھا تلک القصۃ البدیعۃ
واوردوا ھناک ھاتا الحکایۃ
العجیبۃ، فلما زدت ایمانا و
کملت ایقانا طفقت التفحص
تلک الآیات وأتجسسھا فی
القعدۃ والقیامات فلم اجد علیھا
ظفرا ولم اقف منھا اثرا، فامرت
بلسان الالھام لا کوھم من
الاوھام ان استنبطھا بعون

میں عرصہ سے بزرگوں کی زبانی یہ سنا کرتا تھا
کہ امام غزالی نے جو ایک بلند پایہ علمائے اسلام
میں تھے اپنی صلاحیت امکان کے مطابق
احکامی آیات کو جمع کرنا شروع کیا تھا۔ جن
کی تعداد پانچ سو تھی۔ ایک مدت کے بعد
جب میں نے کبار علماء کی کتب اصول پڑھیں
تو ان میں بھی اس عجیب و غریب اور دلچسپ
حکایت کا تذکرہ نظر سے گزرا، مگر ایمان و
یقین میں پختگی و کمال کے بعد جب میں نے ان
آیتوں کو تلاش کرنا شروع کیا تو شب و
روز تلاش و جستجو میں منہمک رہنے کے
باوجود مجھے اس میں نہ کامیابی ہوئی اور نہ
اس سلسلہ میں کوئی کتاب دستیاب ہوئی۔
پھر میں الہام سے اس پر مامور ہوا کہ اللہ کی
مدد اور توفیق سے یہ اہم کام انجام دوں۔
چنانچہ میں نے قرآن مجید کی ترتیب کے موافق
ان آیتوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا جن سے فقہی
احکام، اصولی قواعد اور کلامی مسائل کا استنباط

اللہ تعالی وتوفیقہ وأستخرجھا
بھدایۃ طریقۃ فأخذت اجمع
الآیات التی استنبطت عنھا
الاحکام الفقھیۃ والقواعد
الاصولیۃ والمسائل الکلامیۃ
بالترتیب القرانیۃ ثم فسرتھا
باحسن وجہ من التفسیر و
شرحتھا باکمل جھۃ من التحریر
اخذا من الکتب المتداولۃ
لفحول العلماء والزبر المتداورۃ
بین الائمۃ وما ذلک من فن
وشعب بل من فنون مختلفۃ و
شعب کثیرۃ [1]

ہو سکتا تھا۔ پھر عمدہ طریقے سے ان کی تفسیر
بیان کی اور اس کے ہر پہلو سے ان کی شرح
کی۔ اور اپنی کتاب میں ماہر علماء کی متداول
کتابوں، ائمہ کے درمیان معروف و مقبول
تصنیفات اور ان کے علاوہ بھی مختلف علوم
و فنون کی کتابوں سے مدد لی۔

گو ملا جیون کے مذکورہ بالا بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس موضوع پر قدماء کی کتابیں دستیاب نہیں تھیں، تاہم ان کی تفسیر کا اکثر مواد تفسیر کبیر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ انھوں نے براہ راست اس سے استفادہ نہیں کیا بلکہ بالواسطہ دوسرے مصادر سے اس سے فائدہ اٹھایا ہے جس کی تفصیل دیباچہ میں موجود ہے۔

تفسیر کے مراجع | اس تفسیر کی ترتیب میں ملا جیون کے پیش نظر علم تفسیر اور دیگر علوم و فنون کی جو

[1] تفسیر احمدی، ص ۴۔ ۵ مطبوعہ حسنی پریس کلکتہ۔

کتابیں رہی ہیں ان کی فہرست انہوں نے مقدمہ میں درج کی ہے۔ فن تفسیر میں انوار التنزیل و مدارک التاویل (امام بیضاوی) تفسیر حسینی (ملا واعظ حسین کاشفی) تفسیر کشاف (زمخشری) تفسیر غوری، تفسیر زاہدی اور اتقان فی علوم القرآن (سیوطی) کو انہوں نے اپنا ماخذ بنایا ہے۔ فقہ میں شرح وقایہ مع حواشی۔ ہدایہ مع شروح اور فتاوی حمادیہ اور اصول فقہ میں اصول بزدوی۔ کشف الاسرار شرح البزدوی۔ حسامی، توضیح مع شرح تلویح تفتازانی، اور مختصر ابن حاجب وغیرہ اور علم کلام میں شرح عقائد اور شرح مواقف سید شریف جرجانی ان کا مرجع رہی ہیں [1]

ماخذ کی اس فہرست میں علم حدیث کی کسی کتاب کا تذکرہ نہیں ہے۔ اس سے اس عہد کے ماحول کی عکاسی ہوتی ہے۔ جس میں حدیث کی جانب کم اعتنا کیا جاتا تھا اور فقہ کو غلبہ حاصل تھا۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ خود ملا جیون کو پیرانہ سالی میں سفر حجاز کے دوران صحیحین کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔[2]

ذیل میں اس تفسیر کے بعض مباحث پیش کئے جاتے ہیں ان سے اس کی خصوصیات اور ملا جیون کے طریقہ تفسیر، طرز استدلال اور ان کی نکتہ آفرینی وغیرہ کا اندازہ ہوگا۔

نبیین کی لغوی تحقیق

سورہ بقرہ کی آیت

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل	کچھ سارا کمال اسی میں نہیں ہے کہ تم اپنا منہ
المشرق والمغرب ولکن البر من	مشرق کو کر لو یا مغرب کو لیکن کمال تو یہ ہے کہ
آمن باللہ والیوم الآخر والملائکۃ	کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور قیامت
والکتب والنبیین ..... واولئک	کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتب پر اور
ھم المتقون۔[3]	پیغمبروں پر..... یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔

کی روشنی میں ملا جیون نے ایمان مفصل اور احکام اسلام کی تشریح کرنے کے بعد لکھا ہے:

[1] تفسیر احمدی، مقدمہ ص ۵ [2] خود نوشت، ورق ۴ [3] سورہ بقرہ آیت ۱۷۷

"میرے خیال میں النبیین کو جمع مذکر سالم کے صیغہ میں ذکر کرنے سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ کوئی عورت کبھی نبی نہیں ہوئی بلکہ تمام انبیاء مرد تھے، یہی صحیح بھی ہے اور اس سے ان لوگوں کے قول کی تردید ہوتی ہے جو چار عورتوں حوا، سائرہ، ام موسیٰ اور ام عیسیٰ کو نبی مانتے ہیں۔[1]"

آگے چل کر اس کی مزید وضاحت اس طرح کی ہے کہ:

وقد سما کان یختلج ھذا الاستدلال	یہ دلیل ایک زمانہ سے میرے دل میں ابھر کر
فی صدری ولکن لما امعنت	گونجتی تھی۔ مگر جب میں اس میں غور و تدبر کرتا
النظر وجدت فیہ بحثا لانہ	تو اس میں مزید الجھن پیدا ہوئی کیونکہ اس
یحتمل ان یکون صیغۃ الجمع	کا احتمال ہے کہ جمع مذکر سالم کا صیغہ بربنائے
المذکر السالم باعتبار التغلیب	تغلیب استعمال ہوا ہو۔ جیسا کہ حضرت یوسف
کما فی قولہ تعالیٰ حکایۃ عن	علیہ السلام کے خواب کے واقعہ میں اللہ تعالیٰ
رؤیا یوسف علیہ السلام انی	نے فرمایا ہے۔ انی رأیت احد عشر کوکبا
رأیت احد عشر کوکبا والشمس	والشمس والقمر رأیتہم لی ساجدین۔
والقمر رأیتہم لی ساجدین فان	اس میں لفظ شمس مذکر نہیں ہے۔ سماعی طور
الشمس لم یکن مذکرا۔ اما	پر تو ظاہر ہے اور تاویلاً بھی درست نہیں۔
سماعا فظاھر واما تاویلا فلان	کیونکہ کواکب تو حضرت یوسف کے بھائی ہیں اور
الکواکب اخوۃ یوسف والشمس	شمس و قمر یا تو ان کے والدین ہیں یا ان کے
والقمر ابواہ او ابوہ	والد اور خالہ۔ مگر اس کے باوجود اسے جمع مذکر

[1] تفسیر احمدی ص ۲۴

ان یستدل بقوله وما ارسلنا من قبلك الا رجالا نوحی الیهم لان سوق الکلام وان کان لاجل انه لم یکن من الانبیاء ملك لکن یفهم منه اشارة انه لم یکن من الانبیاء امرأة ایضاً۔[1]

سالم کا ایک فرد بنایا گیا ہے۔ اس لئے مثلاً یہ ہے کہ اس مسئلہ میں قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کیا جائے وما ارسلنا من قبلك الا رجالا نوحی الیهم۔ اس میں گو سیاق کلام اس کا متقاضی ہے کہ کوئی فرشتہ نبی نہیں ہوا مگر اسی سے اشارۃً یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی عورت بھی نبی نہیں ہوئی۔

حنفی مذہب کی تائید ملا صاحب مسلکاً حنفی تھے اس لئے انہوں نے اپنی تفسیر میں جا بجا اس مذہب کی تائید کی ہے۔ ذیل میں اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

قصاص کے مسئلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، امام شافعیؒ اور بعض دوسرے فقہاء کے نزدیک آزاد کے بدلہ آزاد، غلام کے عوض غلام، مرد کے بدلے مرد اور عورت کے بدلے عورت ہی قتل کی جائے گی۔ ان حضرات کا استدلال اس آیت سے ہے۔

یا ایها الذین آمنوا کتب علیکم القصاص فی القتلی الحر بالحر والعبد بالعبد والانثی بالانثی... لعلکم تتقون۔[2]

اے ایمان والو تم پر مقتول کا قصاص فرض ہے۔ آزاد کے بدلہ آزاد، غلام کے بدلہ غلام اور عورت کے بدلہ عورت .... الخ ....

۱؎ تفسیر احمدی ص ۴۲ ۲؎ سورہ بقرہ آیت ۱۷۸-۱۷۹۔

اس کے برخلاف فقہائے احناف آزاد کے بدلہ غلام اور مرد کے بدلے عورت کا درست قرار دیتے ہیں۔ اور وہ اس آیت کو دوسری آیت "النفس بالنفس"[1] سے منسوخ قرار دیتے ہیں اور مشہور حدیث "المسلمون تتکافأ دمائهم" کو بھی وہ بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔

ملاجیون آیت قصاص کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ آیت وجوب قصاص میں برابری اور مساوات کے لئے عبارت النص ہے اور مشروعیت قصاص یعنی مقتول کے بدلہ میں قاتل کو قتل کئے جانے کے سلسلہ میں اشارۃ النص ہے۔ اس کی صراحت ابھی تک کسی نے نہیں کی ہے مگر میں نے اس کو امام زاہد کے اس بیان سے مستنبط کیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جب دو قبیلوں کے درمیان لڑائی ہوتی تھی تو طاقتور قبیلہ (بنونضیر) کے لوگ کمزور قبیلہ (بنوقریظہ) کے دو آزاد آدمیوں کو اپنے ایک آزاد آدمی کے بدلہ میں اور ان کے ایک آزاد مرد کو اپنے ایک غلام کے عوض میں قتل کر دیتے تھے اور اسی طرح ان کے ایک آدمی کو اپنی عورت کے بدلہ میں قتل کیا کرتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس فعل کو حرام قرار دیا گیا... اس طرح آیت کا صحیح مطلب یہ ہوگا کہ ایمان والو تم پر مقتول کا قصاص یعنی اس میں مساوات و برابری فرض کی گئی ہے نہ کہ زیادتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد الحر بالحر، والعبد بالعبد، والانثی بالانثی کی وضاحت بھی کی گئی ہے، یعنی ایک آزاد کے بدلہ میں ایک آزاد ہی قتل کیا جائے دو نہیں، اور غلام کے بدلہ میں غلام ہی قتل کیا جائے، آزاد نہیں اور عورت کے عوض عورت ہی قتل کی جائے مرد نہیں۔"[2]

۱؎ سورہ مائدہ آیت ۴۵ ۲؎ تفسیر احمدی، ص ۴۳

ملا جیون آیتِ قصاص کو سورہ مائدہ کی آیت "النفس بالنفس" الخ سے منسوخ نہیں مانتے بلکہ اس کی خوبصورت توجیہہ کرتے ہوئے فقہائے احناف کی تائید کرتے ہیں۔

ولی فی ھذا المقام جواب حسن و ھو انہ لما کان مدار القصاص علی المساواۃ ینبغی ان من یقتل یقتل ذکرا کان او انثی حرا کان او عبدا صغیرا کان او کبیرا صحیحا کان او مریضا، وانما نص اللہ الحر بالحر لانھم کانوا لم یقتلوا القاتل ولم یقتصروا علیہ بل یقتلون الحر بالعبد والحرین بالحر والذکر بالانثی والمعنی اقتلوا الحر الواحد اذا کان ھو القاتل والانثی اذا کانت ھی القاتلۃ فیکون الایۃ حجۃ علی مالک والشافعی غیر ان تکون منسوخۃ۔[1]

میرے پاس اس موقع کے لئے بہترین جواب یہ ہے کہ جب قصاص کا دار و مدار مساوات پر ہے تو جس نے قتل کیا ہے اسی کو قتل کیا جانا چاہئے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ آزاد ہو یا غلام، کمسن ہو یا بڑا صحت مند ہو یا مریض۔ آیت شریفہ میں الحر بالحر الخ کی وضاحت اس لئے وارد ہے کہ عرب صرف قاتل ہی کو قتل کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ غلام کے بدلہ آزاد۔ اور ایک آزاد کے بدلہ میں دو آزاد مرد اور عورت کے بدلہ میں مرد کو قتل کرتے تھے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ آزاد نے اگر قتل کیا ہو تو اسے قتل کیا جائے اور اگر عورت قاتلہ ہو تو اسے قتل کیا جائے اس طرح یہ آیت منسوخ ہوئے بغیر امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے خلاف دلیل بن جائے گی۔

[1] تفسیر احمدی ص ۴۴۔

اس کی تائید متاخرین علمائے احناف کے اقوال سے بھی ہوتی ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:۔

وکان النظر الاصلی ای المساواۃ نفیا لقولھم بالرجل منا الرجلین الخ لا نفیا للقصاص بین الرجل والمرأۃ۔[1]

اس میں اصل مقصود مساوات ہے اور اس سے ان کے اس قول کی تردید مقصود ہے کہ ہمارے ایک آدمی کے بدلہ میں دو آدمی قتل کئے جائیں گے اس سے مرد اور عورت کے درمیان قصاص کی نفی نہیں ہوتی۔

وما اُھل لغیر اللہ کی تفسیر سورۃ بقرہ کی آیت انما حرم علیکم المیتۃ والدم و لحم الخنزیر وما اھل بہ لغیر اللہ... الخ[2] میں وما اھل بہ لغیر اللہ کی تفسیر کرتے ہوئے ملا جیون لکھتے ہیں:

"اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے علاوہ کسی بت مثلاً لات وعزی یا کسی نبی کا نام لیکر ذبح کیا جائے۔"[3] ملا صاحب نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان کے عہد میں جو جانور اولیاء اللہ کی نذر و نیاز کے طور پر ذبح کئے جاتے ہیں ان کا کھانا حلال ہے کیونکہ ذبح کے وقت ان پر غیر اللہ کا نام نہیں لیا جاتا۔[4]

ملا جیون کے اس استنباط پر صاحب تفسیر جواہر القرآن نے اعتراض کیا ہے لکھتے ہیں:

"تفسیر احمدی میں دوسرے پارے کی تفسیر میں جو یہ لکھا ہے کہ "اولیاء اللہ کی نذر و نیاز کا کھانا جائز ہے۔" مردود ہے الّا آنکہ اس کی یہ تاویل نہ کی جائے کہ نذر کرنے والے کا مشرکانہ عقیدہ بدل گیا تو اس کا کھانا جائز ہے۔[5]"

[1] تفسیر بیان القرآن جلد ۱ ص ۹۹ [2] سورۃ بقرہ آیت ۱۷۳ [3] تفسیر احمدی ص ۳۹ [4] ایضاً
[5] تفسیر جواہر القرآن از مولانا حسین علی صاحب ج ۱ ص ۹۴۔

مولانا اشرف علی تھانوی ؒ نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں ملاجیون کا دفاع کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"بعض لوگوں کو تفسیر احمدی کی عبارت سے جو شبہ ہوا ہے۔ اس کا جواب اس کے منہیہ سے ظاہر ہے کہ ملا صاحب نے ایصال ثواب کی بنا پر حلت کا حکم لگایا ہے اور وہ بلا تاویل حلال نہیں کہتے۔"[1]

مشرک اور اہل کتاب عورتوں سے نکاح کا حکم

سورۃ بقرہ کی مندرجہ ذیل آیت میں مشرک مردوں اور مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کا حکم وارد ہوا ہے۔

ولا تنکحوا المشرکات حتی یؤمن ولأمة مؤمنة خیر من مشرکة ولو اعجبتکم ولا تنکحوا المشرکین حتی یؤمنوا ولعبد مؤمن خیر من مشرک ولو اعجبکم، اولٰئک یدعون الی النار والله یدعوا الی الجنة والمغفرة باذنه ویبین آیاته للناس لعلهم یتذکرون۔[2]

اور نکاح مت کرو کافر عورتوں کے ساتھ جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں اور مسلمان عورت لونڈی بہتر ہے کافر عورت سے گو وہ تم کو اچھی ہی معلوم ہو، اور عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت دو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں اور مسلمان مرد غلام بہتر ہے کافر مرد سے گو وہ تم کو اچھا ہی معلوم ہو، یہ لوگ دوزخ کی تحریک دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت کی تحریک دیتے ہیں اپنے حکم سے۔ اور اللہ تعالیٰ اس واسطے آدمیوں کو اپنے احکام بتلا دیتے ہیں تاکہ وہ لوگ نصیحت پر عمل کریں۔

---

[1] بیان القرآن جلد ۱، ص ۹۷ [2] سورۃ بقرہ آیت ۲۲۱

اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے ملاجیون نے مشرک اور اہل کتاب عورتوں سے نکاح کا حکم بھی بیان کیا ہے، اور انہوں نے مفسرین وفقہاء کے اقوال قلمبند کرنے کے بعد اس سلسلہ میں اپنی یہ رائے دی ہے:

وما تفرد به خاطری هو ان معنی قوله تعالیٰ حتی یؤمن حتی یصدقن بنبی ویقرن بکتاب والکتابیة المشرکة کذالک۔[1]

اور میرا اپنا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد حتی یؤمن کا مطلب یہ ہے کہ یہاں تک کہ وہ کسی نبی کی تصدیق کریں اور کسی کتاب کا اقرار کریں۔ چنانچہ مشرک اہل کتاب عورتوں کا بھی یہی حکم ہوگا۔

تفسیر آیات میں ربط و نظم کا اہتمام

ملاجیون کی اس تفسیر میں آیات احکام کی تشریح اور وضاحت کے ساتھ ان کی باہمی مناسبت بھی دکھائی گئی ہے مثلاً سورہ بقرہ میں نہایت تفصیل سے روزہ کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ اس ضمن میں بعض ایسے امور و احکام بھی بیان ہوئے ہیں، جن کا بظاہر احکام صیام سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا ہے جیسا کہ فرمایا:

واذا سألك عبادی عنی فانی قریب أجیب دعوة الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی لعلهم یرشدون۔[2]

اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو میں قریب ہی ہوں منظور کر لیتا ہوں عرضی درخواست کرنے والے کی جب کہ وہ میرے حضور میں درخواست دے سو ان کو چاہئے کہ میرے احکام کو قبول کیا کریں اور مجھ پر یقین رکھیں امید ہے کہ وہ لوگ رشد حاصل کر سکیں گے۔

---

[1] تفسیر احمدی، ص ۸۲ [2] سورۃ بقرہ آیت ۱۸۶۔

ملاجیون احکام صوم پر مشتمل آیتوں سے اس کا ربط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

انہ اجابۃ لدعوۃ استغفارھم	یہ اس دعائے استغفار کی قبولیت کا حکم
من تلک المعصیۃ و بہ	ہے۔ جو روزے کے سلسلہ میں ہونے والی
ینتظم الآیۃ مع ماقبلھا	لغزشوں کے لئے بندوں کی جانب سے کی
وما بعدھا۔[۱]	گئی تھی۔ اس تاویل سے یہ آیت اپنے
	ماقبل و مابعد سے مربوط ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ اس آیت سے پہلے روزہ کے مفصل احکام بیان ہوئے ہیں اور اس کے بعد ان میں سرزد ہونے والی لغزشوں کا تذکرہ ہے۔

اسی طرح سورہ بقرہ کی ایک ہی آیت میں یہ دو علیحدہ علیحدہ حکم ایک ساتھ بیان ہو گئے ہیں۔

یسئلونک عن الاھلۃ قل	آپ سے چاندوں کی حالت کی تحقیقات
ھی مواقیت للناس والحج	کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ وہ چاند آلہ
ولیس البر بان تاتوا البیوت	شناخت اوقات ہیں لوگوں کے لئے اور
من ظھورھا ولکن البر	حج کے لئے اور اس میں کوئی فضیلت نہیں
من اتقی واتوا البیوت	کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے
من ابوابھا واتقوا اللہ	آیا کرو۔ ہاں لیکن فضیلت یہ ہے کہ کوئی
لعلکم تفلحون۔[۲]	شخص حرام سے بچے اور گھروں میں ان کے
	دروازوں سے آؤ اور خدائے تعالیٰ سے
	ڈرتے رہو امید ہے کہ تم کامیاب ہو۔

---

[۱] تفسیر احمدی ص ۵۵ [۲] سورہ بقرہ آیت ۱۸۹

ملاجیون ان دونوں علیحدہ حکموں کے درمیان ربط کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

فان قیل ما وجہ اتصال قولہ	اگر یہ کہا جائے کہ ان دونوں احکام میں کیا
تعالیٰ ولیس البر ببیان الاھلۃ	تعلق ہے اور یہ دونوں بغیر کسی مناسبت
فی آیۃ واحدۃ من غیر	کے ایک ہی آیت میں کیوں ذکر کئے گئے
مناسبۃ قلت وجہ	ہیں تو میں کہوں گا کہ یا تو ان کا تعلق اس
اتصالہ ما قالوا لما ذکر انھا	طور پر ہے کہ چاند کی منزلوں کو حج کا آلۂ
مواقیت للحج وھذا ایضاً من	شناخت اوقات بتایا گیا ہے اور ان
افعالھم فی الحج ذکرہ للاستطراد	کا یہ فعل یعنی گھر میں دروازہ کے بجائے
والتبعیۃ او انھم سألوا	پشت کی طرف سے داخل ہونا بھی زمانہ
عن الامرین جمیعا فاجاب	جاہلیت میں حج کا ایک فعل تھا۔ اس لئے
عنھما او انھم لما سألوا	ضمناً اس کا ذکر بھی حج کے ساتھ کیا گیا
عما یعنونہ ولا یتعلق بعلم	ہے۔ یا یہ کہ انہوں نے ان دونوں احکام
النبوۃ وترکوا السوال عما	کے متعلق دریافت کیا تھا۔ اس لئے دونوں
یعنونہ ویختص بعلم النبوۃ	کے جوابات دئے گئے۔ یا یہ کہ انہوں نے
عقب بذکرہ جواب ما سألوا	وہ بات دریافت کی جس کا تعلق خود ان
تنبیھا علی ان اللائق بھم ان	سے ہے علم نبوت سے اس کا کوئی تعلق
یسئلوا امثال ذلک ویھتموا	...نہیں اور انہوں نے وہ بات چھوڑ
بالعلم بھا او ان المراد التنبیہ	دی جو علم نبوت ہی کے ساتھ مخصوص ہے
علی تعکیسھم السوال وتمثیلھم	اور ان کے لئے مفید ہے، تو ان کے سوال

بحال من ترك باب البیت ودخل من ورائه [1]

کا جواب دینے کے بعد اس کو بھی تاکیدی طور پر ذکر کیا گیا کہ تمہارے لئے بہتر تو یہ تھا کہ تم اس طرح کی باتیں دریافت کرتے اور ان کو جاننے کی کوشش کرتے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے ان کے الٹے سوالات پر تنبیہ مقصود ہو اور ان کی مثال اس شخص کی حالت سے دی گئی ہو جو گھر کا دروازہ چھوڑ کر اس کی پشت کی طرف سے اس میں داخل ہو۔

اس سے اس اہتمام اور کدوکاوش کا اندازہ ہوتا ہے جو ملا صاحب نے آیات واحکام کی باہمی مناسبت کے تلاش کرنے میں کی ہے سورہ قیامہ کی مندرجہ ذیل آیتوں کے ربط وتعلق کے سلسلہ میں بھی عجیب وغریب تفسیر لکھی ہے۔

لا تحرك به لسانك لتعجل به ان علینا جمعه وقرآنه فاذا قرأناه فاتبع قرآنه ثم ان علینا بیانه۔ کلا بل تحبون العاجلة

اے پیغمبر آپ قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے تاکہ آپ اس کو جلدی جلدی لیں ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کر دینا اور اس کا پڑھوا دینا تو جب ہم اس کو پڑھنے لگا کریں تو آپ اس کے تابع ہو جایا کیجئے پھر اس کا بیان کر دینا ہمارے ذمہ ہے۔ اے منکرو ہرگز

[1] تفسیر احمدی ص ۶۴

وتذرون الآخرة [1]

ایسا نہیں بلکہ تم دنیا سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ بیٹھے ہو۔

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ملا جیون نے پہلے تو مفسرین کا یہ عام قول نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وحی کی آمد کے وقت جلدی جلدی اسے یاد رکھنے کے لئے اس کو دہرایا کرتے تھے تاکہ وہ محفوظ رہ جائے۔ مگر پھر وہ اس قول پر اپنی بے اطمینانی ظاہر کرتے ہوئے خود یہ لکھتے ہیں کہ اس صورت میں ماقبل ومابعد کی آیات سے اس بات کا کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

وقد تصرف الآیة الی بیان حال الانسان المتکبر یوم القیامة وقت قراءة اعماله ای لا تعجل ایها الانسان بقراءة کتاب الاعمال بل تأمل فیه۔ وانتظر فانا جمعنا فیه من اعمالك فاذا قرأناه فاتبع قرانه بالاقرار وبالتامل فیه ثم ان علینا بیانه بالجزاء علیه وکذا الیعرف قوا! کلا تحبون العاجلة الی روع الانسان ... فتم الکلام کله انتظاما [2]

اس آیت کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں متکبر انسان کی قیامت کے دن کی حالت بیان کی گئی ہے کہ جب اعمال نامہ اس کو پڑھنے کے لئے دیا گیا ہو کہ اے انسان اس اعمال نامہ کو پڑھنے میں جلدی نہ کر بلکہ اس میں غور کر اور ٹھہر۔ ہم نے اس کو جمع کیا پھر جب ہم اسے پڑھیں تو تو اسے اقرار اور تامل کے ساتھ پڑھ پھر ہم اس کا بدلہ واضح طور پر دیں گے۔ اسی طرح کلا تحبون العاجلة کو بھی اس انسان کی حالت پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ پوری بات مربوط ہو جائے گی۔

[1] سورہ قیامہ آیات ۱۶-۲۱ [2] تفسیر احمدی ص ۶۹۴-۶۹۵

اخبار علمیہ

ہندوستان کی مسلم صحافت میں بعض انگریزی رسائل وجرائد کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔
اب ہماری نظر سے ایک اور سنجیدہ وبامقصد رسالہ ماہنامہ ینگ مسلم ڈائجسٹ گذرا ہے، یہ بنگلور سے جناب ڈی اے قاضی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے، اس کی مجلس ادارت میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا مجاہد الاسلام قاضی شریعت، مولانا عبد الکریم پارکھ اور سید مصطفی رفاعی ندوی شامل ہیں، رسالہ تمام تر مذہبی رنگ میں ہے، تازہ شمارہ میں طبری، زمخشری، رازی، قرطبی، ابن کثیر، آلوسی، سید قطب، صابونی، مولانا تھانوی، مولانا دریابادی، مولانا محمد شفیع اور مولانا مودودی کی تفسیروں کی مدد سے ایک جامع تفسیری سلسلہ QURAN SPEAKS کے نام سے شروع کیا گیا ہے، حدیث کے لئے بھی ایک مستقل کالم ہے، BACK TO SUNNAH کے عنوان سے افتخار تمکین کا مضمون اچھا ہے، دوسرے اور مضامین کے علاوہ بچوں کے لئے چند صفحات مخصوص کیے گئے ہیں، رسالہ ظاہری لحاظ سے بھی مرصع ومزین ہے، یہ انگریزی داں حلقہ میں پذیرائی کا مستحق ہے، سالانہ چندہ پچاس روپے ہے۔

آج کے دور میں سنجیدہ وثقیل رسالوں کی اشاعت کو برقرار رکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، ابھی ملک کے ایک سنجیدہ مجلہ SEMINAR نے خاموشی سے اپنی اشاعت کے تیس سال مکمل کر لیے، آزادی کے بعد جب ملک کے سامنے نئے نظریات وتصورات اور جدید رجحانات وخیالات کے دروازے وا ہوئے تو ان مسائل پر اس رسالہ میں دعوت غور وفکر دی گئی، مختلف طبقات کے برسر آوردہ اہل فکر نے اس میں مقالے لکھے، مسائل کا علمی تجزیہ کیا گیا اس سے یقیناً بڑا فائدہ ہوا۔ ۸۷ء میں رسالہ کے بانی رومیش تھاپر کے انتقال کے بعد اندیشہ تھا کہ یہ رسالہ بند نہ ہو جائے لیکن ان کی صاحبزادی ملاوکا سنگھ اور داماد تجیبیر سنگھ نے بڑی خوبی سے اسے زندہ وتوانا رکھا۔

شخصیات، جدید مسائل ونظریات کی طرح تاریخی مسلمات کا تجزیہ بھی غیر جانب داری، حقیقت پسندی اور انصاف وسنجیدگی کا متقاضی ہے، ملک میں ایسے تجزیہ نگار گو کم ہیں لیکن بالکل مفقود بھی نہیں ہیں، ٹائمز آف انڈیا کے ایک تازہ شمارہ میں جناب ایس جی سار ڈیسائی کا مضمون CRY FROM THE HEART کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے ملک کے ارباب حل وعقد اور اہل سیاست سے بڑی دردمندی سے یہ التجا وفریاد کی ہے کہ وہ ملک کو برباد ہونے سے بچائیں۔
انہوں نے لکھا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ صدیوں تک ہندوستان مذہبی اور ثقافتی اکائی کا نمائندہ رہا ہے لیکن تاریخ اس کی بھی شاہد ہے کہ اس اتحاد میں کثرت اور وحدت میں تنوع کی جلوہ گری تھی اور یہ صرف واقعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کی ضرورت بھی تھی، ایک عظیم آبادی والے وسیع وعریض ملک میں جہاں تہذیبوں، زبانوں، ذاتوں، مذہبوں، مذہبی فرقوں اور رسم ورواج میں اس درجہ تنوع اور گوناگونی ہو اس کو ایک ہی دھارے، ایک ہی رنگ اور ایک ہی ثقافت میں محدود کرنا ممکن نہیں۔ اور اگر سیاسی قوت واقتدار کے بل پر کسی ایسے نظام اور ہندو راشٹر کو مسلط کیا گیا تو مشترکہ ثقافت اور سیاسی وحدت کے بجائے صرف باہمی جنگ وجدال اور تباہی وبربادی ملک کا مقدر ہو جائے گی۔

تیلگو زبان کے شاعر ڈاکٹر آر سی نارائن ریڈی کو اس سال گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ جو علم وادب کے سرکاری اعتراف کی سب سے بڑی علامت ہے، ابتداءً ان کی شاعری رومانی تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ روحانیت اور انسانیت کی ترجمان ہو گئی، ڈاکٹر ریڈی نے حیدرآباد کے نظام کالج میں اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کی، ظاہر ہے ان کی شاعرانہ نشو ونما میں حیدرآباد کے سخن پرور ماحول اور اردو زبان کا اثر ضرور ہوگا، مگر انہوں نے اس کا اعتراف نہیں کیا، تاہم انہوں نے صنف رباعی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ رباعی میں ایک مصرعہ کا اضافہ کر کے تیلگو زبان میں انہوں نے ایک نئی صنف پنج پدی کا تجربہ کیا۔

("ع۔ص")

ادبیات

منقبت حضرت عمر فاروقؓ

نظم: محمد ولی الحق انصاری۔ پروفیسر و صدر شعبہ فارسی (ریٹائرڈ) لکھنؤ یونیورسٹی

یہ بھی تھا ایک معجزہ قرآنِ پاک کا
اک دشمنِ رسول ہو خادمِ رسولؐ

دو میں سے اک "عمر" ہو ایمان سے سرفراز
کرلی خدا نے اپنے نبی کی دعا قبول

کانٹے کی شکل میں جو نمایاں ہوا تھا وہ
باغِ نبی کا بن گیا سب سے حسین پھول

وہ پھول جس کا سب سے جدا رنگ و بو ہے
خوشبو سے جس کی مصر ہوا آشنائے دین

پھیلایا جس نے شام و فلسطین میں حق کا نام
کی جس نے پاک کفر سے ایران کی سرزمین

پختہ تھا اس بشر کا رسالت پہ اعتقاد
کامل اس آدمی کا تھا توحید پر یقین

دنیا کی طاقتوں سے نہ مرعوب جو ہوا
رہتا تھا جس کے دل میں ہمیشہ خدا کا خوف

دنیا سے تھی زیادہ جسے عاقبت کی فکر
بے چین جس کو رکھتا تھا روزِ جزا کا خوف

جو مفلسوں کی آہ سے ڈرتا رہا مدام
ہو کر امیر بھی تھا جسے ہر گدا کا خوف

ہوتا تھا غم نہ اس کو مصائب سے دہر کے
اس کو نہ فقر و فاقہ سے رہتا تھا کچھ ہراس

کہتا تھا: "کوئی چیز نہیں مفلسی کا غم
مایوس حق نہ ہو کوئی توڑے نہ کوئی آس

ہاں! ایسے وقت سے اسے ڈرنا ضرور ہے
آجائے جب ہوسِ دولت کسی کے پاس"

تشریح جس نے دین کی اپنے عمل سے کی
جس نے بتایا ہوتا ہے "انسان" کا کیا وقار

جب تھا غلام اس کا کجاوے میں محوِ خواب
وہ چل رہا تھا اونٹ کی تھامے ہوئے مہار

اور واقعہ یہ کب کا ہے؟ حاصل تھے جب اسے
امت کی سربراہی، خلافت کا اقتدار

فاتح تھا پھر بھی صلح کے خاطر وہ امن دوست
راضی ہوا کہ چھوڑ کے آقا کا اپنے در

تالیفِ قلب کے لئے مفتوح قوم کی
کرلے قبول ملکِ فلسطین کا سفر

اور سنتِ رسولؐ پہ کرتے ہوئے عمل
ترجیح دے وہ صلح کو میدانِ جنگ پر

پیشِ نظر تھا اس کے معابد کا احترام
غیروں کے دل کے درد کا بھی تھا وہ چارہ ساز

گرجے کو اہلِ دین کہیں مسجد بنا نہ لیں
اس ڈر سے پڑھ سکا نہ کلیسا میں وہ نماز

تفسیر اس کی ذات "لکم دینکم" کی تھی
جس سے چھپے ہوئے تھے نہ دنیا و دیں کے راز

اک ناشناسِ دین کے خنجر کی ضرب سے
دنیا سے کوچ کر گیا وہ مردِ خرقہ پوش

ثانی نہ اپنا چھوڑ گیا اس جہان میں
امت کا وہ امیر، وہ درویش سخت کوش

کاشانۂ نبی کا وہ روشن چراغ تھا
اک آگ کے پجاری نے جس کو کیا خموش

جانبِ خلدِ بریں سید صباح الدینؒ رفت

نظم

جناب وارث ریاضی، ایم اے، چمپارن، بہار

اے صباح الدین! اقلیمِ ادب کے تاجدار
تیری مرگِ ناگہاں پر دیدہ و دل اشکبار

تیری رحلت کی خبر پر رنج و غم سے ہیں نڈھال
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ ادب، اہلِ کمال

مضمحل ہے اہلِ دانش کا چمن تیرے بغیر
سونی سونی ہے ادب کی انجمن تیرے بغیر

اے ادیبِ نکتہ داں! علم و ادب کا پاسباں
غالبؔ و اقبالؔ اور خسروؔ کے فن کا ترجماں

حضرت شبلیؒ کے تو پہلو میں جاکے سوگیا
تو بھی شاملِ کاروانِ رفتگاں میں ہوگیا

پیکرِ صدق و صفا! اے نازشِ قوم و وطن
تجھ کو جنت میں جگہ بخشے خدائے ذوالمنن

از جہاں در یک ہزار و نہ صد و ہشتاد و ہفت
جانبِ خلدِ بریں سیدؔ صباح الدین رفت

۱۹۸۷ء

مطبوعات جدیدہ

شہید جستجو (ڈاکٹر ذاکر حسین) از جناب ضیاء الحسن فاروقی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت دیدہ زیب، صفحات ۷۰۶، قیمت ۷۵ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی شخصیت اپنی قومی وملی خدمات، علم وفضل اور سیرت واخلاق کی بلندی کی وجہ سے نہایت دلآویز اور دلکش تھی، وہ مشہور مفکر اور ماہر تعلیم ہونے کے علاوہ جدید ہندوستان کے معمار اور مسلمانوں کے ممتاز فرد تھے، ان کی کتاب زندگی کا ہر ورق شکوہ وعظمت، علم کے وقار، استقامت عمل، خلوص وصداقت، خیر وخوبی، محنت ومجاہدہ، انکسار وفروتنی، مروت وشرافت، رفق ولینت، ایمانی فراست، اور قلندرانہ شان سے معمور ہے، ڈاکٹر صاحب کی سیرت وسوانح پر متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، تاہم ایک مکمل وجامع سوانح عمری کی ضرورت باقی تھی، جس کا قرض جامعہ ملیہ کے ذمہ عرصہ سے چلا آرہا تھا، چنانچہ جامعہ نے یہ ذمہ داری اردو کے مشہور اہل قلم جناب ضیاء الحسن فاروقی کے سپرد کی جو ہر طرح اس کام کے لئے موزوں اور اہل بھی تھے اور ذاکر صاحب کے پورے مزاج واداشناس بھی تھے اور جیسی توقع تھی، انہوں نے یہ کام بڑی خوبی، انہماک اور دلچسپی سے انجام دے کر ڈاکٹر صاحب کی سوانحعمری کا حق ادا کر دیا، ان کی یہ کتاب اردو کے سوانحی ذخیرہ میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔ ۷۰۶ صفحات کی اس ضخیم تالیف میں ابتدائیہ اور اشاریہ کے علاوہ پندرہ ابواب ہیں شروع کے پانچ ابواب میں ذاکر صاحب کے خاندان، ابتدائی تعلیم پھر ایم اے او کالج علی گڈھ کے زمانہ تعلیم، جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ان کے قیام کے حالات قلمبند کئے ہیں اس ضمن میں جرمنی میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا ذکر بھی ہے، بعد کے چار ابواب، تعلیم سماج تمدن، بنیادی قومی تعلیم، سچی مذہبیت سچی

قومیت، اور تخریب کے مرحلے تعمیر کے حوصلے، کے زیر عنوان ہیں، دسواں باب مسلم یونیورسٹی میں ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کے احوال پر مشتمل ہے، بقیہ ابواب میں بہار کی گورنری اور جمہوریہ ہند کے عہدہ نائب صدارت وصدارت کے عہد کی تفصیلات ہیں، پندرہواں باب اختتامیہ کے عنوان سے ہے، یہ تنہا ایک شخص کی سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ گزشتہ نصف صدی کی سیاسی قومی وملی اور علمی و تعلیمی سرگرمیوں کی روداد بھی ہے۔ جس میں سرسید کی تعلیمی تحریک، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا پس منظر، تحریک خلافت اور ترک موالات، حکیم اجمل خاں، محمد علی جناح، مولانا آزاد، پنڈت نہرو اور گاندھی جی وغیرہ مختلف تحریکوں اور شخصیتوں کے عزائم اور طریقہ کار پر بڑی قیمتی معلومات یکجا ہو گئی ہیں، حکیم اجمل خاں میموریل فنڈ سے متعلق گاندھی جی اور گھنشیام داس برلا کی خط وکتابت عبرت آموز ہے (ص ۱۷۶) جامعہ ملیہ کے قیام کو سمجھنے کے لئے سرسید سے ذاکر صاحب کا اختلاف کا ذکر بھی اہم ہے (ص ۶۶) مولانا آزاد اور ذاکر صاحب کے رشتہ تعلقات میں فاضل مولف نے چند عقدوں پر انگلی اٹھائی ہے اور پھر خوبی سے ان کی گرہ کشائی بھی کی ہے (ص ۴۲۷) تعلیم سماج تمدن، بنیادی قومی تعلیم، سچی مذہبیت سچی قومیت، کے ابواب میں ذاکر صاحب کی تقریروں اور تحریروں کے شاہکار نمونوں کی روشنی میں اس طرح بحث کی ہے کہ ان موضوعات پر کام کرنے والوں کے لئے ایک سامان فکر ونظر مہیا کر دیا ہے، ذاکر صاحب تحریر وتقریر دونوں میں صاحب اسلوب تھے، ان کے خطبات تو فکر کی گہرائی، زبان کی سادگی اور جذبہ کی گرمی کی وجہ سے منفرد نوعیت کے ہیں۔ دار المصنفین کی گولڈن جبلی کے موقع پر انہوں نے جو خطبہ دیا تھا وہ بقول مولانا سید ابو الحسن علی ندوی خطبات کا تاج محل تھا کتاب میں اس خطبہ کے بھی بعض اہم اقتباسات دیے گئے ہیں (ص ۵۱۶) ۵۴ء میں جب ڈاکٹر راجندر پرشاد، جمہوریہ ہند کے صدر تھے تو ذاکر صاحب کی قیادت میں یوپی میں اردو کو علاقائی زبان کا درجہ دیے جانے کیلئے تقریباً بیس لاکھ دستخطوں کے ساتھ ایک میمورنڈم پیش کیا گیا تھا، اس وقت یہ سعی رائگاں گئی تھی۔ بعد میں ذاکر صاحب خود صدارت کے عہدہ پر فائز ہوئے لیکن میمورنڈم بدستور طاق نسیان

کی زینت بنا رہا، فاضل مولف نے اس مسئلہ کی جو توجیہہ کی ہے وہ گو متوازن ہے مگر ممکن ہے بعض لوگوں کو اس سے اتفاق نہ ہو (ص ۴۰۰) فاروقی صاحب نے عموماً اپنی رائے کے اظہار سے گریز کیا ہے لیکن کہیں کہیں مختصر مگر معنی خیز جملوں میں انہوں نے بہت کچھ کہہ دیا ہے، مثلاً اردو ہندی قضیہ کے سلسلہ میں وہ یہ کہہ کر بحث ختم کرتے ہیں کہ "عجب ہیں اس جمہوریت کے تقاضے بھی جس میں بندوں کو صرف گنتے ہیں اور اکثریت کا جبر ایک سیاسی قدر بن جاتا ہے" (ص ۳۲۳) اختتامیہ، ذاکر صاحب کے حسن خاتمہ کا غماز ہے جس میں ان کی سچی مذہبیت اور اخلاق حسنہ کا عطر کشید کیا گیا ہے، ذاکر صاحب اپنے علم و عمل اور عقیدہ و اخلاص کی بدولت عمر بھر سرخرو رہے، وہ مایوس ہونے والے نہیں تھے مگر فاضل مرتب کے بقول زندگی کے آخری چند برسوں میں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے مستقبل کو دیکھ کر وہ اداس رہنے لگے تھے (ص ۴۵۹) یہ انکشاف آج بھی ایک طبقہ کے لئے عبرت سے خالی نہیں ہے، مصنف نے صاحب سوانح کی تحریروں میں "مذہبیت کے آہنگ جمالی" کی جانب اشارہ کیا ہے، لیکن اس کتاب میں خود ان کا یہی آہنگ جمالی، عقل و روح کے لیے سامان نشاط فراہم کرتا جاتا ہے، ایک بار شاہ معین الدین ندوی مرحوم سے جب ڈاکٹر ذاکر صاحب رخصتی مصافحہ کر رہے تھے تو برساتی میں ایک بہت تیز بجلی کا بلب جل رہا تھا، شاہ صاحب کے وجیہہ چہرہ کو دیکھ کر ذاکر صاحب نے کہا ماشاء اللہ چہرہ پر نور برس رہا ہے، شاہ صاحب نے برجستہ جواب دیا، جی نہیں یہ جمال ہم نشیں کا عکس ہے، فاروقی صاحب کے قلم کے نور و سرور و حضور میں اسی جمال ہم نشیں کے آہنگ کا عکس صاف جھلکتا ہے، کتاب میں چند نادر تصویریں بھی ہیں، کتابت و طباعت کا معیار بہت بلند ہے پھر بھی وہ سہو کتابت سے خالی نہیں مثلاً "مولانا کی دل جیت لیا" (۲۰۵) "سیدھا سادا آدمیوں ہوں" (ص ۲۰۶) وغیرہ، اردو کا ادب عالیہ اس بہترین سوغات کے لئے فاضل مولف اور مکتبہ جامعہ دونوں کا شکر گزار ہے۔

طریق النجات مرتبہ مولانا محمد حسن صاحب مجددی فاروقی، تقطیع کلاں، صفحات ۲۵۰ کاغذ مناسب، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ترکی سکہ میں ۔۔ اٹی ایل، پتہ: حقیقت کتابوے استنبول، ترکی۔

ادارہ وقف اخلاص ترکی کی بعض انگریزی مطبوعات پر ان صفحات میں تبصرہ کیا جا چکا ہے، زیر نظر کتاب بھی اس کے سلسلہ مطبوعات کی ایک کڑی ہے، اصل کتاب عربی زبان میں تھی، مصنف کے صاحبزادے مولانا محمد ہاشم مجددی نے اس کا اردو ترجمہ کیا اور اصل عربی کتاب مع اردو ترجمہ کے پہلی بار ۱۹۳۱ء میں ہندوستان سے شائع ہوئی تھی اب ترکی سے حسین حلمی ایشیق صاحب نے اسے دوبارہ شائع کیا ہے، بقول مترجم اس کتاب میں قرآن مجید کے اسرار و رموز کو نہایت سہل انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے، چنانچہ عقائد، ادلہ اربعہ محبت آل و اصحاب رضؓ، بدعت کی تعریف و تقسیم، اعمال بدنیہ اور ضرورت تقلید جیسے موضوعات پر داد سخن دی گئی ہے، ضرورت تقلید کی بحث دلچسپ ہے مگر اس میں مناظرانہ رنگ بھی ہے ان کے علاوہ اعمال روحانیہ، آفات لسانیہ، فضیلت صبر و شکر، ذم غضب و کینہ و حسد، زہد و فقر اور مسئلہ روح وغیرہ مسائل تصوف کا بھی لطیف بیان ہے، شیخ احمد بن محمد اسکندرانی کی کتاب حکم سے ۲۱۸ حکیمانہ اقوال کا انتخاب بھی ہے جو بار بار پڑھنے کے قابل ہے، آخر میں مسئلہ تقدیر پر ایک بحث رسالہ تنویر در بیان مسئلہ تقدیر کے عنوان سے شامل ہے۔ ترجمہ سلیس ہے مگر بعض مقامات پر سلاست برقرار نہیں رہی (ص ۲۴۹) بعض جگہ ترجمہ میں احتیاط کا لحاظ نہیں رکھا گیا مثلاً واتفق العلماء ان المفسرین تکلموا فی البطن الاول من القرآن کا ترجمہ اس طرح کیا گیا کہ "علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مفسرین کا منتہائی کلام قرآن مجید کے بطن اول تک ہی محدود ہے"۔ (ص ۳۷)

وقار مرتبہ جناب محمد یونس انصاری اعظمی، تقطیع متوسط، صفحات ۲۰۴، کاغذ کتابت طباعت، عمدہ۔ پتہ: وقار الملک ہال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وقار الملک ہال کے طلبہ کا سالانہ علمی و ادبی مجلہ وقار کے نام سے شائع ہوتا ہے ۸۹ء کا یہ مجلہ اپنے مقالات و مضامین، افسانوں، غزلوں اور نظموں کے لحاظ سے معیاری اور علی گڑھ کی ادبی روایات کا حامل ہے۔ مجلہ کے مندرجات تجلیات، گزارشات، تبرکات، ادبیات

مقالات، کتابیات، مشاہدات، تخیلات وغیرہ مختلف عنوانات کے تحت دئے گئے ہیں اس سے لائق مرتب کے حسن ذوق کا پتہ چلتا ہے، مضامین اچھے ہیں، خصوصاً ادبیات و مقالات کے حصہ میں ڈاکٹر اصغر عباس کا مضمون، سجاد حیدر یلدرم اور علی گڑھ، اور شہاب الدین اعظمی کا مضمون، شبلی کی خطوط نگاری، قابل ذکر ہیں، افسانوں اور غزلوں میں شرافت اور متانت ہے، مجموعی حیثیت سے یہ مجلہ طلبہ کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا غماز اور حوصلہ افزائی و قدر دانی کا مستحق ہے۔

دیوان المعلم عبد الحمید الفراہیؒ مرتبہ مولانا بدر الدین اصلاحی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۶ قیمت ۷ روپے، پتہ: دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڈھ۔ یو۔پی۔

مولانا حمید الدین فراہیؒ قرآن مجید کے متبحر عالم تھے، ان کے لئے شعر و شاعری کوئی مایہ فخر بات نہ تھی مگر وہ فطری شاعر تھے اس لیے جب کسی خاص واقعہ سے متاثر ہوتے تو بے اختیار ان کی زبان سے ترانہ موزوں ادا ہونے لگتا تھا، وہ اردو، فارسی اور عربی تینوں زبان میں شعر کہتے تھے، یہ ان کے عربی کلام کا مجموعہ ہے جس کا بڑا حصہ بلقان اور طرابلس کے خوں چکاں واقعات پر مشتمل ہے، جس سے مولانا کی دینی و ملی حمیت اور شدت تاثر کا پتہ چلتا ہے، باقی حصہ میں حکمت و موعظت پر مشتمل اشعار درج ہیں۔ ان میں دنیا کی بے ثباتی اور زمانہ کے تغیر سے انسان کو خبردار کرکے ایمان و حکمت کی تلقین کی گئی ہے۔

اسلامی نکاح مرتبہ جناب عتیق احمد بستوی، کاغذ کتابت طباعت عمدہ، صفحات ۱۶ قیمت چار روپے، ملنے کا پتہ: انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، مرادی روڈ، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

قرآن و سنت کی روشنی میں نکاح کی شرعی حیثیت پر فاضل مرتب کا ایک مفید مضمون شائع ہوا تھا، مسلم معاشرہ کے موجودہ مسائل کے پیش نظر اب اسے رسالہ کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ اپنی افادیت کے لحاظ سے یہ ہر شخص کے مطالعہ کے قابل ہے۔

("ع۔ص")

تصنیفات مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۱. سیرۃ النبی جلد سوم۔ معجزہ کے امکان و وقوع پر علم کلام اور قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث۔ قیمت ۵۸/-
۲. سیرۃ النبی جلد چہارم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض۔ ۵۸/-
۳. سیرۃ النبی جلد پنجم۔ فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد پر سیر حاصل بحث۔ ۴۸/-
۴. سیرۃ النبی جلد ششم۔ اسلامی تعلیمات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔ ۵۸/-
۵. سیرۃ النبی جلد ہفتم۔ معاملات پر مشتمل متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ۔ ۲۳/-
۶. رحمت عالم۔ مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کیلئے سیرت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ۔ ۷/-
۷. خطبات مدراس۔ سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے۔ ۱۶/-
۸. سیرت عائشہؓ۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات و مناقب و فضائل۔ ۲۵/-
۹. حیات شبلیؒ۔ مولانا شبلیؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔ ۵۸/-
۱۰. ارض القرآن ج ۱۔ قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی عصری اور تاریخی تحقیق۔ ۲۴/-
۱۱. ارض القرآن ج ۲۔ بنو ابراہیم کی تاریخ قبل از اسلام، عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان۔ ۱۸/-
۱۲. خیام۔ خیام کے سوانح و حالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف۔ ۴۵/-
۱۳. عربوں کی جہاز رانی۔ بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔ ۱۵/-
۱۴. عرب و ہند کے تعلقات۔ ہندوستانی اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی) ۳۹/-
۱۵. نقوش سلیمانی۔ سید صاحب کے منتخب مضامین کا مجموعہ جن کا انتخاب خود موصوف نے کیا تھا (طبع دوم عکسی) ۴۲/-
۱۶. یاد رفتگان۔ ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحبؒ کے تاثرات ۳۳/-
۱۷. مقالات سلیمان (۱) ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔ ۳۳/-
۱۸. مقالات سلیمان (۲) تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ۔ ۲۹/-
۱۹. مقالات سلیمان (۳) مذہبی و قرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں) ۲۹/-
۲۰. برید فرنگ۔ سید صاحبؒ کے یورپ کے خطوط کا مجموعہ۔ ۲۰/-
۲۱. دروس الادب حصہ اول و دوم۔ جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے ۳/- ۶/-

"منیجر"